ماہنامہ

حیات نو

ANJUMAN TALBA-E-QADEEM

انجمن طلبۂ قدیم

BILARIAGANJ - AZAMGARH (U.P.) INDIA

یادِ رفتگاں

اک چراغ اور بجھا!

اشعر الفطری

فما کان قیس هلکه هلک واحد ۔ ولکنه بنیان قوم تهدما

"کل عالم حادث" کا مقولہ اگرچہ کافی پرانا ہے لیکن آج تک کوئی بھی اس کی صداقت کو چیلنج کرنے والا پیدا نہیں ہوا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور نہایت تلخ بھی کہ یہ دنیا فانی ہے اسے دوام نہیں۔ جو شخص بھی اس عالم ہست و بود میں قدم رکھتا ہے وہ کل نفس ذائقۃ الموت کی سنت کے تحت موت کا مزا ضرور چکھتا ہے۔ یہ دنیا ایک سرائے ہے جس میں کسی کو ہمیشگی اور دوام نہیں جو بھی آئے گا اسکو ایک دن لازماً جانا پڑے گا اور اس اصول میں کوئی تفریق نہیں، دنیا کی زندگی کسی کیلئے ابدی و دائمی نہیں خواہ وہ کیسا ہی ذی حشمت ذی اثر ہو کتنا ہی ذی علم و ذی عقل ہو۔ لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو مر کر بھی زندہ رہتی ہیں جو اپنے علم و عرفان، اپنے ایمان و ایقان اور اپنے اخلاق و کردار کی وجہ سے زندہ و جاوید ہو جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے علم و فکر کی وجہ سے مر کر بھی زندہ ہوتے ہیں۔ جب تک زندہ رہتے ہیں تاریکیوں کے خلاف اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں اور جاتے جاتے سینکڑوں چراغ روشن کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی جدائی بہت شاق گذرتی ہے ان کا سوگ ہمہ گیر پیمانے پر منایا جاتا ہے لیکن قدرت کے اس اٹل اور ناقابل تغیر قانون کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں۔

چنانچہ ایسے ہی لوگوں میں مفسر قرآن مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحی مرحوم کا شمار ہوتا ہے مولانا ۴ر فروری بروز جمعہ شام سات بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ط

مولانا مرحوم تدریسی خدمت انجام دینے کیلئے ہر ہفتہ اپنے گاؤں بمہور سے جامعۃ الفلاح تشریف لاتے تھے بسا اوقات سواری نہ ملنے کے سبب اپنی ضعیفی اور ناتوانی کے باوجود پیدل ہی اعظم گڈھ تک آجاتے تھے اور پھر وہاں سے سواری مل جاتی تھی۔ ۲۴ر جنوری بروز دوشنبہ مولانا بمہور سے اعظم گڈھ تک پیدل ہی آئے لیکن ضعف کی بنا پر چکرا کر گر گئے اور کافی زخمی ہوئے لیکن ہمت استقلال کی اسی حالت میں جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ پورے جامعہ میں ہلچل سی مچ گئی ہم لوگ جب عیادت کیلئے گئے تو فرمایا "اب خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے"۔

دو دن بعد مولانا اپنے گاؤں چلے گئے وہ رو بصحت ہو چلے تھے کہ اچانک یکم فروری کو مسجد میں تھے، نماز کیلئے گئے تو فالج نے مار دیا آپ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے جب حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تو مشن ہسپتال اعظم گڈھ میں داخل کر دیا گیا لیکن موت کا وقت آچکا تھا کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ تین دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے اور پھر آخر اسی عالم میں خدا کو پیارے ہو گئے۔ جلد ہی یہ خبر وحشت اثر پورے دیار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس نے سنا ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔ [illegible] کی ایک بڑی تعداد نے نماز جنازہ میں شرکت کی خدا تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

مولانا مرحوم عالم باعمل تھے آپ نے پوری زندگی قرآن کے درس و تدریس میں گزاری۔ قرآن پر آپ کی گہری نظر تھی۔ آپ بہت سادہ اور خوش اخلاق تھے آپ اکثر فرماتے کہ معیار زندگی ایسا ہونا چاہئے کہ زندگی کسی کی خاطر پریشانی کا سبب نہ بنے اور مرحوم تا آخر اسی اصول پر کاربند رہے۔ مولانا کی وفات سے جامعۃ الفلاح میں ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے خدا سے دعا ہے کہ وہ جامعہ کو اس کا بہترین بدل عطا کرے۔ آمین

دھڑکنیں

جشنِ جمہوریت

وطن میں تلخ نوائی مری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاق

ہر قوم کے کچھ اصول و معیار ہوتے ہیں جن پر قومیں بنتی اور زندہ رہتی ہیں۔ جن پر ان کے کلچر و ثقافت اور تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ہم ان کو بجا طور پر کسی قوم کے اجزائے ترکیبی کا نام دے سکتے ہیں جن سے انحراف و روگردانی قوم کو ذلت و مسکینیت کے غار میں دھکیل دیتی ہے۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ قوموں کے عروج و کمال اور زوال و انحطاط دراصل ان کے صلاح و فسادِ عمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اب یہ خیال ایک مفروضے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کہ قوموں کی تقدیریں بنانے اور بگاڑنے میں اس کے عروج و زوال میں گردشِ فلک اور گردشِ لیل و نہار کی کارفرمائی ہوتی ہے بلکہ درحقیقت قوموں کی زندگی و موت کچھ عوامل و محرکات کے اچھے اور برے ردعمل پر منحصر ہوتی ہے لیکن ان عوامل کے ردعمل کا ظہور یک بیک نہیں ہوتا بلکہ اس کا آغاز ایک نقطے سے ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ چھوٹے سے بھی سنگین حقیقتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لیکن کچھ حقیقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ انسان جان بوجھ کر ان سے صرفِ نظر کرتا ہے اور معاملہ فہمی کے بجائے راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور قسم ہا قسم کی تاویلات و توجیہات میں لگ جاتا ہے چنانچہ وہ قوم اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لیتی ہے۔

ان سطور کی تحریر کے وقت پورے ملک میں جشنِ جمہوریت بڑی شان و شوکت سے منایا جا رہا ہے۔ اس سال جشن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی بری و بحری اور فضائی افواج نے اپنے جدید ترین اسلحہ جات کی نمائش کی جس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ ہندوستانی قوم بیدار ہے اور اس میں ارتقاء کا عمل برابر جاری ہے، یہ جشنِ جمہوریت دراصل اس خوشی کے اظہار کے طور پہ منایا جاتا ہے کہ ہم ایک آئینی نظام اور جمہوری پارلمانی نظام رکھتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد سے بحیثیت قوم ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اس امر میں تو شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہم نے اس ۳۵ سالہ عرصہ میں تعلیم کے میدان میں اور سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے جس سے بیرونی ممالک اور متمول ریاستوں پہ ہماری دھاک بیٹھ گئی لیکن جب ہم اندرونِ ملک نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور اس وقت ہماری کیفیت ٹھیک اس مور کی سی ہوتی ہے جو ناچتے ناچتے

[illegible] تو تھک جاتا ہے اور اداس ہو کر ناچنا بند کر دیتا ہے۔

آج ملک تشدد و دہشت گردی کی جس ڈگر پہ جا رہا ہے وہ ہر صاحبِ فہم و فراست کے لیے تشویشناک ہے ایک طرف آسام کا مسئلہ ہمالہ کی طرح سر اٹھائے کھڑا ہے تو دوسری طرف پنجاب کا مسئلہ اپنی سنگینی کے اعتبار سے کوہِ ہمالیہ سے کم نہیں ظلم و بربریت اور تشدد کی ایک لہر ہے جو پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے۔

پاکستان کو لوگ اس لئے نگاہِ استخفاف سے دیکھتے ہیں کہ وہاں آج تک کوئی دستور و آئین نافذ نہ ہو سکا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ہم ایک آئینی نظام رکھنے اور ملک کو پارلیمانی نظام کے تحت چلانے کا دعویٰ کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ ہمارے دستور Constitution میں نہایت خوشنما اور دیدہ زیب الفاظ میں اقلیتوں کے جانی و مالی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے لیکن میں جمہوری نظام کے علمبرداروں سے سوال کرتا ہوں کہ کیا یہی جمہوریت ہے کہ اقلیتوں اور پسماندہ طبقات کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے اور ان کا خون پانی کی طرح بہایا جاتا رہے، اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق خود انہی مظلوموں پر فرقہ واریت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب مراد آباد میں عید کی نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں پر پولیس نے گولیوں کی بوچھار کی تو وہ اس وقت فرقہ واریت کو ہوا دے رہے تھے۔

آج فسادات ایک کھیل بن گئے ہیں آزادی کے بعد ہندوستان کی آج اقلیت ہی سازشوں کا شکار ہے گذشتہ ۲۵ برسوں سے یہی کہانی بالکل یکساں انداز میں دہرائی جا رہی ہے۔ ہر فساد کے بعد کچھ بیانات آ جاتے ہیں، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو دور کرنے کے لئے کچھ تجاویز پاس ہو جاتی ہیں اور ابھی ان بیانات کے سیاہی خشک بھی نہیں ہوتی ان تجاویز پہ عمل درآمد بھی نہیں ہو پاتا کہ ایک دوسرا فساد ہو جاتا ہے۔ خود وزیر داخلہ کے بیان کے مطابق:

”یکم اکتوبر ۱۹۸۱ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۸۲ء تک دس ماہ میں ۳۴۶ فسادات ہوئے“ (امپیکٹ لندن ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

برطانیہ کا ایک موقر جریدہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے انکشاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ”خود بھارت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق آزادی کے ۳۶ سالوں میں دس ہزار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں پانچ لاکھ سے زائد افراد زخمی یا ہلاک ہوئے۔“ (عربیا، لندن اگست ۱۹۸۳ء)

اس حساب سے اوسطاً ہر سال ہندوستان میں ۲۷۰ فسادات ہوئے جن میں ہلاک یا زخمی ہونے والوں کی تعداد تیرہ ہزار نو سو سالانہ ہے۔ یہ ہیں جمہوریت کے فیوض و برکات اور اس پر بلراج مدھوک جیسی ذہنیت رکھنے والے لوگ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بے جا ناز برداری کی جا رہی ہے۔

اگر بات اسی پر ختم ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی۔ دستور میں اقلیتوں کو تہذیبی و تعلیمی تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے لیکن آزادی کے بعد سے مسلمانوں کا معاشی استحصال کیا جا رہا ہے، ان پر سرکاری نوکریوں کے دروازے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت بند کر دیے گئے ہیں، ان کی تاریخ مسخ کرنے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے، ان کے تہذیبی ورثہ اور قومی سرمایہ کو ختم کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں، مسلم اداروں کے حقوق حکومت کے حق میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ یہ سارے واقعات ہیں جو جمہوریت کے نام پر ہم پر روا رکھے گئے ہیں اور ہم ہر سال جشنِ جمہوریت منا کر یادوں کے زخم تازہ کر لیتے ہیں۔

دستور میں تبدیلیٔ مذہب کا حق ہونے کے باوجود جب میناکشی پورم کے چند سو ہریجنوں نے بڑی ذات کے ظلم وستم سے تنگ آکر اسلام کے نظامِ عدل و قسط میں پناہ لی تو یہ جمہوریت نواز اور جمہوری نظام کے علمبردار چیخ اٹھتے ہیں اور پیٹرو ڈالر کا راگ الاپا جاتا ہے حالانکہ یہی لوگ جب عیسائی مذہب اور بدھ مذہب اختیار کرتے ہیں تو کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی اخبارات میں کوئی بیان نہیں آتا کوئی تحقیقاتی کمیشن نہیں بٹھایا جاتا۔ کسی کو امریکی ڈالر اور روسی روبل کا طعنہ نہیں دیا جاتا۔ اس مسلسل نشتر زنی سے مسلمان کے زخم ہائے دل ناسور بن گئے ہیں۔

یہ تمام واقعات جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی حکومت کے لئے نہ صرف باعثِ ننگ و عار ہے بلکہ ملک و قوم کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں۔ اگر ہندوستان میں اقلیتوں کو جانی و مالی اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت اور ان کے قومی و ملی تشخص کی بقا اور ان کی تہذیبی و تعلیمی آزادی کی ضمانت نہ دی گئی اور ان کو دبانے اور ان میں احساسِ کمتری پیدا کرنے کے لئے اسی طرح دہشت و تشدد کا طریقہ اپنایا جاتا رہا اور مشرقی تہذیب و تمدن کو گلے سے نہ لگایا گیا، امن و امان کی فضا بحال نہ کی گئی، اقلیتوں کو ان کے حقوق نہ دیئے گئے تو یہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

سید راشد علی حامدی

ادبی منظر نامے پر

تجدید کا آفتاب طلوع ہو گیا۔

معیاری ادبی جریدہ سہ ماہی "تجدید" علیگڈھ کا پہلا شمارہ مشاہیر قلمکاروں کی تخلیقات سے مزین، عمدہ طباعت اور خوبصورت گٹاپ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

قیمت عام ایڈیشن، فی شمارہ ۶ روپے — قیمت (سالانہ) چار شمارے ۲۰ روپے

لائبریری ایڈیشن ۲۰ روپے

نمونہ کے لئے پانچ روپے کا پوسٹل آرڈر ارسال کیجئے۔

رابطہ :- راشد شاذ (مدیر تجدید سہ ماہی) ۱۲۹، محمد حبیب ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے:

سید علیم الحق عمری

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ

عن ابی رقیۃ تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدین النصیحۃ قلنا لمن؟ قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم (رواہ مسلم)

محترم حضرات! انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کے اس دوسالہ کونشن کی اس اہم نشست کا حق تو یہ تھا کہ درس حدیث کا فریضہ کسی صاحب علم اور موزوں شخص کے ہاتھوں انجام پاتا۔ میں خود اس کیلئے آمادہ نہ تھا مگر بعض مخلص احباب کے اصرار اور خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ ایک مختصر سی حدیث تھوڑی سی تشریح کے ساتھ آپ حضرات کے سامنے بیان کر دوں۔ یہ حدیث اگرچہ کہ مختصر ہے لیکن اپنے مفہوم اور معنی کے لحاظ سے احادیث کے ایک بڑے ذخیرے پر بھاری ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ شریعت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

اس حدیث کے راوی ابو رقیہ تمیم ابن اوس الداری ہیں۔ ابو رقیہ آپ کی کنیت اور تمیم بن اوس آپ کا اسم گرامی ہے ۹ھ میں آپ نے اسلام قبول کیا۔ جلیل القدر صحابہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ علم باعمل اور نہایت شب زندہ دار تھے۔ بعض آسمانی کتابوں کا علم بھی رکھتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حادثۂ قتل کے بعد مدینہ منورہ سے شام منتقل ہوئے اور بیت المقدس میں قیام کیا اور وہیں پر ۴۰ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ اور بیت جبرین میں دفن کئے گئے۔ آپ کی جملہ احادیث کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ حدیث وہ واحد حدیث ہے جس کو امام بخاری نے اپنے جامع میں اور ان معدودے چند میں سے ہے جسکو امام مسلم نے اپنے جامع میں ذکر کیا۔ راوی حدیث کے اس مختصر سے تعارف کے بعد آئیے اب متن حدیث پر تھوڑی سی روشنی ڈال لیں۔

الدین النصیحۃ دین جیسا تو آپ ہے کلام عرب میں لفظ دین مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً جزا و سزا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "ملک یوم الدین" اسی سے خدائے تعالیٰ کا ایک نام "دیان" بھی ہے۔ عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے "کما تدین تدان" اسی طرح اطاعت و فرمانبرداری کے معنی میں بھی لفظ دین کا استعمال ثابت ہے۔ عربی کے ایک شاعر اعشیٰ مازنی کے ایک شعر کا مصرعہ ہے جس میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

یا سید الناس و دیان العرب

اسی معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں ارشاد نبوی ہے "کان علی دیان ھذہ الامۃ" اسی طرح دعوت اسلامی اپنے آغاز کار میں جس مرحلے سے گزر رہی تھی اس موقع پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

"اُرِیدُ مِنْ قُرَیْشٍ کَلِمَۃً تَدِیْنُ بِھِمُ العَرَبُ" میں قریش سے وہ کلمہ چاہتا ہوں کہ جس کی وجہ سے سارا عرب ان کا مطیع ہو جائیگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں استعمال

یہ لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا "الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت" اور عرفاً لفظ دین ان تمام آسمانی مذاہب کے لئے بولا جاتا ہے جو اسلام سے پہلے موجود تھے جیسا کہ آپ کے بارے میں آتا ہے "انہ علیہ الصلوۃ والسلام کان علی دین قومہ"۔ یہاں دین سے مراد اہل عرب کا خود ساختہ دین نہیں بلکہ شریعت ابراہیمی کا وہ مجموعہ ہے جو بعض عبادات اور نکاح کے بعض مسائل پر مشتمل تھا اور جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا اسی طرح حج کے موقع پر آپ کا یہ ارشاد منقول ہے "کانت قریش ومن دان دینہا ..."۔

شریعت کی اصطلاح میں لفظ دین سے مراد اسلام ہے۔

اور قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اسلام کو لفظ دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا اس کی شرعی اصطلاح ہوئی جیسا کہ کہا گیا ہے "ان الدین عند اللہ الاسلام" دوسرے مقام پر کہا گیا "ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ شیئاً" خوارج کے بارے میں آپ کا یہ قول مشہور ہے "یمرقون من الدین مروق السہم من الرمیۃ" وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے"۔ اس میں آپ کا اشارہ دین کی طرف ہے۔

ایک مشہور حدیث، حدیث جبرئیل کا ٹکڑا ہے۔ صحابہ سے خطاب فرماتے ہوئے آپ کہتے ہیں۔

"ھذا جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم" یعنی اسلامکم

النصیحۃ یہ ایک جامع کلمہ ہے "نصح الرجل ثوبہ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں سینا۔ نصح اور خائط مترادف ہیں ناصح کو ناصح اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس طرح کپڑے کے سوراخ کو سی کر بند کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایک ناصح یعنی خیر خواہ جس کی وہ خیر خواہی چاہتا ہے اس کی خامیوں پر لفٹ دہی کر کے اس کو دور کر دیتا ہے۔ یا یہ کہ وہ "نصحت العسل" سے ماخوذ ہے یعنی صفیتہ من الشمع کہ میں نے شہد کو کچرے سے صاف کیا۔ اس لئے ایک خیر خواہ ریشہ دوانیوں اور اپنی [illegible] سے خالی ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا فریب یا کسی غرض کا شائبہ نہیں ہوتا اس لئے اس کو ناصح کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں خیر خواہی کا کیا مطلب ہے؟

علماء نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یعنی خدا کی ذات پر ایمان لانا، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور اس کے ساتھ میں کسی کو شریک نہ کرنا اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی جن صفات کا ذکر قرآن شریف اور اقوال نبی میں آیا ہے اس پر یقینی ایمان لانا اور اسی طرح اس کی شریعت کی پیروی کرنا اس کی نافرمانی سے بچنا، زندگی کے مختلف امور میں اس نے جو تعلیمات دی ہیں ان پر عمل کرنا۔ تمام چیزیں النصیحۃ للہ میں داخل ہیں حقیقتاً اگر دیکھا جائے تو یہ مختصر سا جملہ ان تمام گمراہ فرقوں اور باطل نظریات کی تردید کرتا ہے جو باری تعالیٰ کی صفات کے متعلق ہوں۔ اور خود ذات باری تعالیٰ کے متعلق قائم کر لئے گئے ہوں۔ نمایاں طور پر ان میں سے وہ فرقے ہیں جو اسلامی تاریخ کی ابتداء میں ظاہر ہوئے تھے۔ جیسے معتزلہ، معطلہ، مشبہ اور مجسمہ وغیرہ ان کے متضاد اور گمراہ کن خیالات نے اصول وعقائد کی رو سے امت مسلمہ کو ایک عظیم نقصان پہنچایا اور جن کی روشنی میں خدائے تعالیٰ کی ذات ایک مضحکہ خیز شکل میں نظر آتی ہے۔ حقیقتاً ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے عقائد سے متعلق ان خالص چیزوں کو اور حقیقتوں کو عقلیات کی روشنی میں حل کرنا چاہا۔ اور متناقض نظریات کا شکار ہو گئے۔ خود بھی بھٹک گئے اور بہت سوں کے بھٹکنے کا سبب بنے۔ مذکورہ ان فرقوں اور ان کے نظریات کے مقابلے میں سب سے محتاط اور مناسب رویہ علمائے اہل سنت والجماعت کا رہا ہے یعنی جو کچھ بیان کیا ہے اور جس کی تشریح جیسی کچھ اس کے رسول کی تصریحات میں ملتی ہیں۔ ان پر بغیر کسی تاویل اور چوں و چرا کے ایمان لایا جائے۔ اور یہی النصیحۃ للہ کا تقاضہ ہے۔ البتہ یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے حق میں خیر خواہی کا کیا مطلب ہے؟ اس لئے کہ وہ کسی بھی معاملے میں مخلوق کا محتاج نہیں آخر ایک بندہ اس کا خیر خواہ کیسے بن سکتا ہے۔

علمائے حدیث نے اس اشکال کو دور کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ درحقیقت یہ خیر خواہی اللہ کے لئے نہیں بلکہ بندے کی خود اپنی خیر خواہی ہے اور وہ خیر خواہی اسی کی طرف لوٹے گی۔ ورنہ حاشا کلا خدا کی ذات اس سے بہت اعلیٰ ہے اور وہ کسی بھی خیر خواہ کی خیر خواہی سے بے نیاز ہے۔

پھر آپ نے فرمایا "النصیحۃ لکتاب اللہ" یعنی اللہ کی کتاب کے لئے خیر خواہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد اور یقین رکھنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اسی کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ انسانوں کے کلام سے منفرد اور جدا ہے۔ ایک ایسا اعجاز جس کی آج تک کوئی مثال پیش نہ کر سکا۔ اور ساتھ ہی اعتقاد و یقین کے اس مرحلے کے بعد لازماً اور واجباً اس کی تعظیم اور جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے اسی طرح تلاوت کرنا اور تلاوت کے لئے پورے قواعد کا لحاظ رکھنا اور ان تمام حقیقتوں کو تسلیم کرنا جن کو وہ مختلف مقامات پر پیش کرتا چلا جاتا ہے اور کسی قسم کی تاویل اور کسی بھی قسم کی تحریف و تبدیل سے پرہیز کرنا۔ علمائے حدیث نے خصوصاً اس نقطہ پر زور دیا ہے اس لئے کہ خود علماء کا ایک بڑا طبقہ قرآن مجید کے بعض مقامات پر قرآن مجید کی بعض آیات کی تاویلات میں بری طرح ٹھوکر کھا گیا ہے۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہی ہے کہ آدمی امور دین میں اور مسائل شرعیہ میں خواہ مخواہ کے تکلف اور بے کار تاویلات سے بچے۔ علمی اور نظری پہلو کے ساتھ ساتھ قرآن مجید پر ایمان لانے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ آدمی اس کی تعلیمات کو عملی شکل بھی دے۔ اور اس کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کو اپنی زندگی میں جاری و ساری کرے۔ یہ تمام چیزیں "النصیحۃ لکتاب اللہ" میں داخل ہیں۔

پھر آپ نے "النصیحۃ لرسولہ" اس کے رسول کے لئے خیر خواہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی آپ کی رسالت پر ایمان لائے اور یہ اعتقاد رکھے کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت زمان و مکان کے حدود و قیود سے ہٹ کر تا قیامت دائمی ہے۔ اور یہ کہ شریعت اسلامی کا اجراء اسی کا مقام دوم ہے۔ اور قرآن کے بعد وہ ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس مقام پر علماء نے خصوصاً اس نقطہ پر زور دیا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے جس طرح قرآنی تعلیمات منفرد حیثیت رکھتی ہے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال بھی اس لئے کہ آپ کے اقوال و افعال درحقیقت قرآن ہی کی تفصیل ہے یہ ناممکن ہے کہ مسلمان کی نجات اس کے بغیر متحقق ہو اس حقیقت کو اس صاف انداز میں قرآن مجید نے متعدد مقامات پر پیش کیا ہے سورۂ نساء میں کہا گیا یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر۔

سورۂ مائدہ میں کہا گیا: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبہم فتنۃ

سورۂ نساء میں فرمایا گیا۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

سورۂ حشر میں ارشاد ہوتا ہے وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا

سورۂ نساء میں ایک دوسرے مقام پر کہا گیا فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان کے نزدیک اسلامی زندگی کے لئے جس طرح قرآن مجید کی تعلیمات اہم ہیں اس سے کچھ کم اہم رسول کی تعلیمات نہیں ہیں علماء نے اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ کی تشریح کی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ النصیحۃ للرسول کا سب سے بڑا تقاضہ تو یہ ہے کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اور آپ کی رسالت کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ آپ رسول آخر ہیں اور آپ کی لائی ہوئی شریعت آخری شریعت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیث میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث جس کو امام بخاری اور مسلم

سے نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے آپ فرماتے ہیں میری اور گذشتہ انبیاء
کی مثال اس عمارت کی سی ہے جسے بہت اچھے ڈھنگ سے بنایا گیا
ہو لیکن ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو۔ دیکھنے والوں نے اسے دیکھا
اس کی کاریگری پر دنگ رہ گئے۔ سوائے اس ایک اینٹ کی چھوڑی
ہوئی جگہ کے علاوہ انہیں کوئی عیب نظر نہیں آیا پھر میرے ذریعہ اس
خلا کو پُر کر دیا گیا اب وہ عمارت مکمل ہے۔ اب مزید اس میں کسی
زیادتی کی ضرورت باقی نہ رہ گئی۔ امام مسلم اور امام بخاری ہی
نے زبیر ابن مطعم سے ایک حدیث نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں:
میرے کچھ نام ہیں: میں محمد ہوں، میں احمد ہوں۔ میں مٹانے والا ہوں
میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا۔ میں اٹھایا جانے والا
ہوں کہ میرے قدموں پر لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ اور میں سب سے پیچھے
آنے والا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا" اسی طرح حضرت ثوبان
سے ایک حدیث مروی ہے آپ فرماتے ہیں۔ میری امت میں
تیس جھوٹے ہوں گے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے
جب کہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ایک اور حدیث
خود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو امام مسلم نے
اپنی جامع میں روایت کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں
مجھے چھ چیزوں کی وجہ سے اور دوسرے انبیاء پر فضیلت دی
گئی ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرے ذریعہ نبوت کا سلسلہ
ختم کر دیا گیا یعنی میں آخری نبی ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی مذکورہ تصریحات سے جو معتبر اور یقینی ذرائع سے ہم تک پہنچی
ہیں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ قیامت تک کے
لئے اس روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے سب سے آخری اور
فرستادہ ہیں آپ کے بعد اب نہ کسی شریعت کے آنے کا احتمال
ہے اور نہ کسی رسول کے بھیجے جانے کا امکان۔ یہی بات ہے کہ آپ کے
پاکیزہ اصحاب نے آپ کے ایک ایک قول و فعل کو اہمیت دی اور
یہ جان کر دی کہ یہ چیز بھی شریعت کا ایک حصہ ہے۔ آنے والی نسل
تک اسے ٹھیک ٹھیک پہنچایا جائے۔ صرف نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم ہی کافی نہیں اور یہ النصیحۃ لرسولہ
اور ایمان بالرسالت کا ہرگز مطلوب نہیں۔ ظاہری تعظیم و تکریم
سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ مسلمان باطنی طور پر آپ کے اقوال
و افعال کو شریعت کا درجہ دے اور آپ کی زندگی کو ایک نمونے کے
طور پر قبول کرے جس طرح کہ صاف کہہ دیا گیا "لقد کان لکم فی
رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"۔

پھر آپ نے فرمایا النصیحۃ لائمۃ المسلمین یعنی
مسلمانوں کے ائمہ و امراء کے لئے خیر خواہی۔ اور یہ جن چیزوں کی
طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ ایک مسلمان کی زندگی کے انفرادی
پہلو ہیں اور یہاں آپ جس چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں
اس کا تعلق اجتماعیت سے ہے امام اور امیر کی خیر خواہی کا مطلب
ہے علماء نے تصریح کی ہے کہ ایک مسلمان بحیثیت مسلمان کے
حق کے معاملات میں اس کا تعاون کرے اور حق بات کے سلسلے میں
اس کی اطاعت کرے۔ ان کے کردار میں ان کی روش میں کوئی غلطی یا
خامی نظر آئے تو نرمی کے ساتھ اس کی نشاندہی کرے ان کے خلاف
بغاوت یا کسی قسم کی شورش برپا نہ کرے اور پھر آپ نے فرمایا
النصیحۃ لعامتہم یعنی مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی۔ یعنی ان
میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے اور جس کسی میں
کسی بھی قسم کی غلطی دیکھے اس پر متنبہ کر دے جو ویسے بھی اس امت
کے افراد کی ایک امتیازی خصوصیت بتائی گئی ہے ان چیزوں سے
معاشرہ یا سوسائٹی وہ مثالی اور پاکیزہ سوسائٹی بنتی ہے جس کی
مثال تاریخ اسلام کے پہلے گروہ نے قائم کی تھی ان مختصر کلمات
کے بعد میں اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ما جنة الخلد إلا في ديارهم ؛ ولو تخيرت هذه كنت أختار
لا تحسبوها بعدها أن تدخلوا سقرا ؛ فليس تدخل يوماً جنة النار

دليل تعاطينا المدام وبيننا ؛ حديث كما هب النسيم على الورد
نعاوده والكأس بيني ؛ والحبيب منه ما ابتدي
ابن زیدون لکھتا ہے۔

يا ليل طل، لا أشتهي ؛ إلا بوصلٍ قصرك
لو بات عندي قمري ؛ ما بت أرعى قمرك
يا ليل خبّر أنني ؛ ألتذّ عنه خبرك
بالله قل لي: هل وفى ؛ فقال: لا بل غدرك

عبداللہ فہد فلاحی
علیگڑھ

جامعۃ الفلاح — مقصد اور خصوصیات

یہ مدارس اپنی اپنی جگہ پر دینِ اسلام کی خدمت و اشاعت اور افکار باطلہ کی تردید و تنقید میں مصروف ہیں اور بحمد اللہ انہی کی بدولت آج ملک میں اسلام اور ملتِ اسلامیہ کا وجود قائم و باقی ہے۔ لیکن اب جبکہ پوری دنیا میں احیائے اسلام کی تحریک اٹھ چکی ہے۔ اسلام اقدامی پوزیشن میں آگیا ہے۔ مختلف ممالک اس کا تجربہ کر رہے ہیں اور غیر اسلامی افکار و نظریات ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں، عالم اسلام میں ہر محاذ پر اسلام اور باطل کے درمیان نمایاں کش مکش شروع ہو چکی ہے اور جکارتہ سے لیکر واشنگٹن تک تمام مسلمان ایک نئے جذبے اور حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اس بات کی شدید ترین ضرورت تھی کہ ایک نئی تعلیمی تحریک چلائی جائے۔ اور ایسے افرادِ ملت کے اندر پیدا کئے جائیں جو

(الف) جو قرآن و سنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ تاریخ میں جتنی گمراہ فرقوں کا نام نشان ملتا ہے وہ سب قرآن و سنت کا گہرا علم نہ رکھنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ باوجود اخلاص د کے وہ دینی حدود سے تجاوز کر گئے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت سے پہلے اپنی امت کو خبردار کر دیا تھا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جنھیں تم مضبوطی سے پکڑے رہوگے اور ان پر عمل کروگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول۔

(ب) جن کی نظر وقت کے مسائل پر ہو، جو غیر اسلامی افکار و نظریات سے واقف ہوں، جو تنقید و اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں اور تمام قدیم و جدید چالنجوں کو اسلام کے معیار پر پرکھ سکیں۔

جہاں یہ بات غلط ہے کہ ہم ماضی کی روایات کو اٹھا کر پیچھے پھینک دیں اور نئی نئی روایات کو اختیار کرنے میں لگے رہیں وہیں یہ بات بھی غلط ہوگی کہ ہم پچھلی ہی باقی روایات کے غلام ہو کر رہ جائیں اور ان کی زنجیروں میں قید ہو کر رہ جائیں۔ مثال کے طور پر صحابہ کرامؓ کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ مدینے کے چھوٹے سے معاشرے کے اندر جو مسائل درپیش تھے اور جب ان کی سلطنت اٹلانٹک کے ساحل سے دریائے سندھ تک پھیل گئی اس وقت جن مسائل سے سابقہ تھا، ان میں بڑا فرق تھا اگر صحابہ کے اندر تنقید اور اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوتی تو دنیا میں وہ تہذیب کبھی برپا نہ کر سکتے جو آج چودہ سو سال بعد کسی نہ کسی شکل میں زندہ ہے۔ امت مسلمہ خدا کی غلام ہے تقلید کی غلام نہیں ہے وہ سنت رسول کی متبع ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز اس کیلئے سند اور حجت کا درجہ نہیں رکھتی۔ آج دنیا بھر میں اسلامی انقلاب کی منزل درپیش ہے اور یہ راستہ تنقید و اجتہاد کے بغیر طے نہیں ہو سکتا ضرورت ہے کہ ایسے افراد اٹھیں جو ایک طرف قرآن و سنت کے سچے متبع ہوں اور دوسری طرف تنقید و اجتہاد کی صلاحیت سے مالامال ہوں تاکہ مغرب کے علمی انداز میں جواب دے سکیں اور ایسا زوردار افکار لائیں جس سے مغرب کی علمی بنیادیں ہل جائیں اور اسلام کی عطا کردہ بنیادوں پر علوم و فنون کی عمارت کھڑی کی جائے بقول اقبال۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(ج) جو اسلامی اخلاق و کردار کے حامل ہوں، اخلاص و ایثار کا مجسمہ ہوں، اجرِ آخرت اور ثوابِ اخروی کی غرض سے تعلیم و تعلّم کا فریضہ انجام دیں اور زہد و قناعت اور فقر کو باعث راحت سمجھیں۔ زبان سے زیادہ کردار سے عوام کی اصلاح و تبلیغ کریں۔ یہاں پرانے زمانے کے ایک استاذ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس میں ہمارے لئے عبرت و موعظت کا کافی سامان موجود ہے:

مولانا عبدالرحیم صاحب (م ۱۲۴۳ھ) رامپور میں درس دیتے تھے۔ روہیل کھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کیلئے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (جو ۵۷ء سے پہلے وہ حیثیت رکھتا تھا جو اس وقت ہزار بارہ سو کی بھی نہیں ہے) پیش کش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اضافہ اور ترقی ہو جائے گی۔ انھوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس روپئے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے۔ ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا پیش کر رہا ہوں، اس کے مقابلے میں اس حقیر رقم کی کیا حیثیت ہے؟ انھوں نے عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیر بہت میٹھی اور مجھے مرغوب ہیں۔ بریلی میں وہ بیر کھانے کو نہیں ملے گا۔ ظاہر ہے انگریز اب بھی ان کے دل کی بات نہیں پا سکا۔ اس نے کہا، رامپور سے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے آپ بریلی میں گھر بیٹھے اپنے درخت کے بیر کھا سکتے ہیں؛ مولانا نے فرمایا کہ ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رامپور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہو جائیگا اور میں ان کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گا، انگریز کی منطق نے اب بھی ہار نہ مانی۔ اس نے کہا میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں۔ وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اس کی تکمیل کریں۔ آخر اس مسلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے لیکن تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا؟ [1]

لیکن بعد میں دینی مدارس کے طلبہ میں کردار کی جو گراوٹ آئی اسے بیان کرنا عبث ہوگا۔ دوسری طرف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو کرپشن، بدکرداری اور بد اخلاقی ہے اسے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ اقبال نے اسی صورت کا رونا رویا ہے ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

دینی مدارس کا ایک سروے کر ڈالئے۔ وہاں کے فارغ طلبہ و اساتذہ کی سیرتوں کو دیکھ لیجئے آپ برجستہ کہہ اٹھیں گے۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

(د) جن میں احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا صحیح جذبہ ہو۔

اس وقت جتنے مدارس موجود ہیں ان کا جائزہ لے لیجئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دینیات کا ایک پیریڈ پڑھا کر یہ سمجھ رہی ہے کہ اس نے اسلام سے محبت کا حق ادا کر دیا۔ سلفی مدرسوں کے فارغین چند رسوم و بدعات کے استیصال ہی کو جہاد سمجھ بیٹھے ہیں، دارالعلوم دیوبند احیائے اسلام کا کام تو کیا کرتا آپسی تنازعات اور سیاسی اقتدار کیلئے کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ ندوہ کے طلبہ بالعموم اسلام کے محدود تصور کو سینہ [illegible] محنت اور جد و جہد میں لگے ہیں۔ تحریروں میں تو اسلام ایک مکمل نظام کی حیثیت سے اجاگر کیا جاتا ہے سیرت احمد شہید

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندوی

مجاہدانہ پہلو بڑی بلاغت اور فصاحت سے بیان کئے جاتے ہیں۔ عالم عرب اور عالم اسلام کے مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے لیکن کیا عملی دنیا میں بھی یہی کچھ ظاہر ہو رہا ہے؟ اس کا جواب ڈھونڈھنے کی ضرورت ہے۔

(۷) جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح و تعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

ان صفات کے حامل افراد کی آج ملک کو عالم اسلام کو ضرورت ہے۔ اور انہی صفات و ضروریات کو پیش نظر رکھ کر جامعۃ الفلاح کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو جامعۃ الفلاح ایک مدرسہ ادارہ یا دار العلوم نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے۔ ایک تحریک جو قدیم و جدید کی کشمکش کو ختم کرے، جو قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہے لیکن حالات کے تقاضوں اور نت نئے مسائل و معاملات سے آنکھ نہ بند کرے، جو اخلاق و کردار ایثار و بے نفسی اور اخلاص و ___ کے ساتھ آگے بڑھے اور گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالا ہو کر احیائے دین کا کام کر سکے۔

جامعۃ الفلاح — ایک مشن ایک عزم

اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جامعۃ الفلاح ایک مشن ہے۔ یہ ایک دعوت کا نام ہے۔ ایک تحریک اور ایک انقلاب کا نام ہے۔ یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ جس کے مذہب میں دنیا و دین الگ الگ خانوں میں بانٹے نہیں جا سکتے، جس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زمین کو اپنے لئے مسجد کہا تھا، جہاں یہ انقلابی تصور مذہب تھا کہ جس طرح نماز روزہ مذہبی اعمال ہیں، اسی طرح روزی کمانا، مشینیں بنانا، لشکر کشی کرنا، تحقیق، ایجادات و اختراعات کرنا۔ اگر یہ سب خدا کو ماننے اور تسلیم کرنے کے ساتھ ہو تو یکساں درجہ میں عبادت ہے اس

دنیا کے پیروؤں نے دنیاوی تعلیم اور دینی تعلیم کو دو مستقل متوازی نظاموں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ ایک طرف دینی تعلیم دی جاتی ہے جہاں جدید مسائل کی کوئی ہوا ہی نہیں لگنے پاتی، دوسری طرف سیکولر تعلیم دی جاتی ہے جہاں اقدار و روایات کا مسئلہ ہی نہیں اٹھتا اور نتیجے کے طور پر پوری قوم پروفیسر خورشید احمد کے الفاظ میں انشقاق ذہنی ( ) اور منتشر شخصیت ( ) کا شکار ہو جاتی ہے۔ جامعۃ الفلاح نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ دین و دنیا کی تفریق ختم کی جائے (گرچہ ابھی اس کی کوششیں ابتدائی نوعیت کی ہیں) اور علوم اسلامی کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔

ایک قابل اعتماد تربیت گاہ:-

اس ادارے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک قابل اعتماد تربیت گاہ ہے۔ یہاں طلبہ کی فکری و عملی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ انہیں تحریک اسلامی کا ایک خادم بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔ انہیں اس لائق بنایا جاتا ہے کہ مستقبل میں جب مسائل حیات سے برد آزمائی کا موقع آئے تو مادیت کی رنگینیوں میں گم نہ ہو جائیں بلکہ اپنے فریضہ منصبی عبودیت الٰہی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں اور دوسرے افراد اور انسانوں کی زندگیوں کو بھی اسی مقصد سے روشناس کرانے کی کوشش کریں۔ یہاں اساتذہ اور طلبہ کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا اور ما نحل والد ولدا افضل من ادب حسن کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ عہد اکبری کے شاہی طبیب اور مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ وہ بغیر طلبہ کے کھانا نہ کھاتے تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہاں کے ایک عظیم استاذ کو بھی چھوٹے بچوں کے ٹوٹے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کو انہی کے ساتھ کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور بیمار طلبہ کا سر دبانا، ان کے دوا دارو کا انتظام کرنا، انہیں نہلانا دھلانا تو

سے نمایاں اساتذہ کی خصوصیت رہی ہے۔

طلبہ کی جاں نثاری و وفاداری اور اپنے اساتذہ کے ساتھ سچا عشق اور لازوال محبت کی قدیم داستانیں ہم سنتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ کے انتقال کی خبر مشہور ہوئی کہ ان کے ایک شاگرد سید شریف عظیم آبادی کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں، دوسرے شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی اس صدمہ کو نہ برداشت کر سکے اور انتقال کر گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی۔

جامعۃ الفلاح کے نامور استاذ اور تحریک اسلامی کے مشہور عالم مولانا جلیل احسن ندوی کا انتقال ہوا تو طلبہ کی حالت ناقابل بیان تھی۔ احسن سے ہر استاد دم بخود رہ گیا۔ سنا ہے طلبہ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ خود علی گڑھ میں ہم نے بعض ساتھیوں کو آنسو ضبط کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ دراصل طلبہ کی سعادت مندی، روحانی تعلق اور قلبی وابستگی کا پتہ دیتا ہے جو طلبہ کو درسگاہ کے اساتذہ سے ہے۔

تحریک اور تعلیم میں ارتباط:-

تعلیم کا تعلق تحریک سے نہ ہو، زندگی کے مسائل، معاملات اور معاشرے کے حالات سے وہ منقطع ہو جائے تو تحقیق، ذہنی عیاشی اور فکری ورزش سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آج کے جملہ مدارس کا یہی حال ہے۔ وہ معلومات کا ذخیرہ تو فراہم کرتے ہیں لیکن ان کو برتنے کی کوئی تربیت نہیں کرتے جبکہ تعلیم محض معلومات فراہم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ معلومات کی روشنی میں معاشرے کا تجزیہ و احتساب، روایات و تہذیب کے تحفظ کا نام ہے۔ یہ ہر استاذ کی ذمہ داری ہے کہ طلبہ کو معاشرے کے تئیں اپنی ذمہ داریاں یاد دلائے۔ وہ اسے خرافات کا ذہنی کھلاڑی اور مدہوش نہ کرے بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کرے اور مسائل حیات سے نمٹنے کا طریقہ بھی سکھلائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب طلبہ تحریک اسلامی سے متعلق ہوں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ تعلیم اور تحریک میں توازن اور اعتدال ہونا چاہیے۔

یہ جامعۃ الفلاح کی نمایاں خوبی ہے کہ وہاں کے طلبہ اور اساتذہ زندگی کے حقیقی مقاصد سے نہ صرف شعوری طور پر آشنا ہیں بلکہ عملی جدوجہد میں بھی مصروف ہیں اور احیائے اسلام کی ہر ایک ذی صلاحیتوں کے بقدر حصہ لے رہے ہیں۔

---

۱ - مولانا ابواللیث صاحب ڈی آئی آر کے تحت الٰہ آباد جیل میں تھے وہاں مولانا کے سامنے راقم الحروف نے مولانا اختر احسن صاحب کا تذکرہ کیا اس وقت مجھ کو محسوس ہوا جیسے مولانا کے ذہن میں پچھلے دور کی پچھلی تمام یادیں تازہ ہو گئیں۔ مولانا نے بڑے عقیدتمندانہ لہجے میں فرمایا:-

"مولانا اختر احسن صاحب بڑے عظیم الشان تھے جسکو کم ہی لوگوں نے محسوس کیا۔ ان کی زندگی قرن اول کی تھی۔ ان سے مجھ کو بڑی تقویت حاصل ہوتی۔ دنیا میں وہ ہمیشہ پیچھے پیچھے اور دبے دبے رہے مگر امید ہے کہ وہ اپنے رب کے یہاں سربلند ہوں گے۔ دنیا میں جتنے ہی زیادہ وہ گمنام رہے، آخرت میں وہ اتنے ہی شادکام ہوں گے۔"

مولانا ایک مدت تک تحریک کی خدمت کرتے رہے ایک عرصہ تک خلقت کو فیض پہنچاتے رہے اپنے دریا علم سے لوگوں کو سیراب کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ماہ ربیع الاول میں بیمار ہوئے بیماری کا کچھ طول ہوا اور بالآخر ۱۰ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء بروز پنجشنبہ بوقت طلوع فجر مولانا نے ایک ہچکی لی، پانی پیا، پھر اپنے رب کو جا ملے۔ روح پرواز کرنے کا ٹھیک وہی وقت تھا جس وقت مولانا اپنے رب کے قدموں میں سر ڈال کر آنسو بہاتے دعا اور مناجات میں مصروف رہا کرتے تھے لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ:

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محمد صلاح الدین عمری
ایم۔ اے (سال آخر)
شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اندلس کی نیچرل شاعری

اندلس میں شاعری کی عمومی ترقی میں عبدالرحمٰن الداخل کی کوششوں کو بہت بڑا دخل ہے۔ اس نے ادباء اور شعراء کو انعام و اکرام سے نواز کر ان کی ہمت افزائی کی۔ ان سے قریبی واسطہ رکھا اور عاقل شعراء کو جو منتقدرہ کے ان کو اس میدان میں طبع آزمائی کرنے کی دعوت دی۔ ابوالحسن زریاب جو بغداد کی تعارف کی وجہ سے گانے بجانے [illegible] کو رواج ہوا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس کو ایک وحدت کا تصور دیا جو کچھ عربی اور ادبی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئے تمدن نے جنم لیا۔ وہاں کے عوام عربی زبان و ادب سے اتنا قریب ہو گئے کہ سارے اندلس کے لوگ خود کو ایک قوم سمجھنے لگے۔ [illegible] کے زمانہ میں سب کا ایک اکائی کی طرح ابھرنا اہم چیز ہے جس کا اثر شاعری پر بھی خاصا پڑا۔ اسی لئے وہاں کی شاعری میں سیاسی شاعری اور ہجو کا عنصر نہیں تھا۔ اس میں نسلی تعصب اور قومی انتشار کی باتیں نہیں ہیں۔ انھوں نے علوم و فنون میں مشرق کی تقلید کی اور تقلید میں اگرچہ ترقی کے مواقع کم ہوتے ہیں لیکن اندلس کی آب و ہوا، دولت و ثروت کی فراوانی، امن و سکون حالات اور ایک وحدت کی شکل میں زندگی گذارنے کی خواہش نے ان کو اس شاعری کرنے پر آمادہ کر دیا جو خارجی اسباب کی وجہ سے فطرت سے متاثر ہو۔ اسی شاعری کو الشعر الطبیعی کا نام دیا گیا۔ اسی کی ترقی ہو کر اس کی دوسری شکل موشحات رکھا گیا۔ اس قسم کی شاعری اور اس طرز کے اثرات مشرق میں نہیں تھے۔ موشحات شاعری کی وہ قسم ہے جس میں عاشقانہ مذاق اور خاص دماغ کو متوجہ کرنے اور پیدا کرنے کی خصوصیات ہیں۔ جس کی وجہ اس کی موسیقی کا ایک خاص زیر و بم ہے جس کو پڑھ کر یا سن کر قاری اور سامع اتحاد کرنے لگتا ہے اسی کے متبذنا مع کر یہ عوامی شاعری ہو گئی زمحل کیا گیا۔ الشعر الطبیعی میں اندلس نے جتنی ترقی کی اتنی مشرق نہ کر سکا۔ اس شعر الطبیعی کے اسباب و عوامل کی وجہ سے وطنی شاعری کا نیا تصور پیدا ہوا اور اسی میں نئی شاعری ہوئی۔

آیئے "الشعر الطبیعی" کو ذرا قریب سے دیکھیں،

فطرت کے حسین مناظر، دلکش نظارے اور خوبصورت وعطر بیز فضائیں انسان کو ہمیشہ متاثر کرتی آئی ہیں۔ جب یہ حسین مناظر ایک عام انسان کی طبیعت میں انبساط پیدا کر دیتے ہیں تو شاعر اور انشاء پرداز جن کے افکار و خیالات کا مرکز ہی فطرت ہوتا ہے یہ کیوں کر متاثر نہیں کریں گے۔ ان کو فطرت کے دلکش مناظر، پھولوں کا کھلنا، ندی نالوں کا شور و شور سے بہتا چلا جانا، شبنم کی چمک دمک، سایہ دار درختوں کا سکون کی شاعری کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان مناظر سے شاعر وہ سب کچھ حاصل کر لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نظریں نہیں دیکھ سکتیں۔

الشعر الطبیعی ادب عربی میں ایک نئی صنف کی حیثیت سے جانی جاتی ہے جس کی بنیاد مغربی ادب ہے۔ مغربی ناقدین اس صنف شاعری کو اواخر اٹھارویں صدی کی جدید رومانی تحریک سے منسوب کرتے ہیں۔ اس تحریک کے افراد نے فطرت میں اپنی آزاد روی سے کام کرنے کا ایک وسیع تر [illegible] میدان کا احساس کیا سرسبز و شاداب مرغزار ان کے احساسات میں جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرت سے انھوں نے وہ موضوعات ڈھونڈ نکالے جو ایک واضح اور مستقل اسلوب کے مناسب ہوتے ہیں۔ انھوں نے فطرت کو ایک سچے اور وفادار ساتھی کی حیثیت

سے بنایا جو ان کے احساسات کو خوش نمائی اور ان کے قلوب کو تسکین عطا کرتی ہے۔ وہ ان سے اتنے قریب ہو گئے کہ اپنے دل کے دکھ درد اور خوشی کے جذبات کو انہی سے بیان کرنے لگے انھوں نے خود کو دنیاوی مصائب و آلام سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے، فطرت کی آغوش میں ڈال دیا۔ جس کی راحت افزا اور تسکین بخش گود میں انھوں نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس طرح کے ادب کو پروان چڑھانے والوں میں جانی جاکر سب سے پہلا اشار مروار تھا جس نے فرانسیسی ادب میں ان ذوقی احساسات کا اضافہ کیا۔

اگرچہ اس صنف کی بنیادی اصطلاحات بہت پہلے ہی پڑ چکی تھی اور یہ کلی طور پر کسی ایک دور کی پیداوار نہیں ہے بلکہ تقریباً سبھی زمانوں میں اس قسم کی یا اس سے ملتی جلتی شاعری ہوئی لیکن اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت رومانی تحریک کے تحت ہی حاصل ہوئی۔

الشعر الطبیعی عربی ادب میں: دور جاہلی شاعری میں فطری شاعری اس حد تک ہوئی جس حد تک اس وقت کے بدوی ماحول نے اس کو اجازت دی۔ اسی دور میں اس صنف پر ایک حد تک خاص شاعری ہوئی۔ شاعر فطرت کو غور سے دیکھتا ہے اس سے اپنے دکھ درد کی باتیں کہتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، پھر اس کی منظر کشی کرتا ہے۔ وہ جب کھنڈرات پر پہونچتا ہے تو اس سے اپنے غم تازہ ہو جاتے ہیں۔ لق و دق صحرا، جنگلات، اس کے وسیع میدانوں، اس کی ریت، وہاں کے راستے، بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور بارش اس کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا، اونٹ اور گھوڑا اس کے ہر قدم کا ساتھی ہے۔ بدوی شاعر اپنے اس محدود ماحول میں رہ کر شاعری کرتا ہے جس میں وصفیہ شاعری کے اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ وہ تاریک رات کو سمندر کی موجوں سے تشبیہ دے کر اس رات کے دہشت ناک ہونے کو بیان کرتا ہے۔ رات کی طوالت کی تشبیہ ستاروں کو یذبل پہاڑ سے مضبوط رسیوں کے ذریعہ باندھ دیئے جانے سے دیتا ہے

بجلی کی چمک وہاں کو راہب کے چراغ کی طرح بتاتا ہے۔ کھنڈرات پر کھڑا ہو کر رونا فطری ماحول کے ساتھ اس کے غم واندوہ اور شکوہ و شکایت کو ظاہر کرتا ہے، اس کا گھوڑے اور اونٹ کا وصف بیان کرنا اس کی مہارت اور عمیق مطالعہ پر دلالت کرتا ہے گویا کہ جاہلی کا شاعر ایک مصور کی حیثیت رکھتا ہے جسکو فطرت اور اسکے مناظر سے محبت ہے، اور وہ فطری مناظر کا وصف بدوی ماحول کے مطابق وضاحت اور بیباکی سے کرتا ہے۔ اموی دور میں جب عربوں نے بداوت سے حضارت میں قدم رکھا اور زندگی کی آسائشوں عالی شان محلات اور خوشنما باغات سے ان کو واقفیت ہوئی تو الشعر الطبیعی میں بھی اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ لیکن اب بھی اس نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار نہیں کی اور اس کا دائرہ وصف غزل، مدح اور خمریات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ اس کا مزاج بدوی شاعری کے مقابلہ میں کافی بدل گیا۔

عہد عباسی کے شعراء نے اگرچہ فطرت کے مناظر کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے لیکن ان کے یہاں بھی داخلی کیفیات اور اندرونی احساسات کا فقدان ہے۔ اس دور میں مادی وصف اور غیر ضروری الفاظ کی کثرت ہے نفاست کلام اور صنائع لفظی پر زور دیا گیا ہے کہ اشعار میں جمالیات اور روحانیت کا فقدان ہونے لگا۔ البتہ اس دور میں ابو تمام، بحتری، الوزیر صنوبری کے یہاں فطرت کی منظر نگاری بہترین انداز میں کی گئی ہے۔ اس دور میں جسکو فطرت کا شعور تھا الشعر الطبیعی کے ارتقا صنوبری کو پایا ہے

اندلس کی فضا نہایت خوشگوار اور حسین تھی۔ سرسبز پہاڑ اس کی بلندیوں کو چھو رہے تھے، اس کی آغوش میں وسیع و عریض میدان اور ان میں لہلہاتا ہوا سبزہ، بہتی ہوئی ندیاں اس کے درختوں پر چہچہاتی ہوئی چڑیاں اور بلبلیں، جا بجا کھلے ہوئے پھول، چرتے ہوئے جانور، شاداب و سرسبز کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسان اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے اور اس پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باد نسیم اس کی فضا اور باغات کے مناظر کو اور بھی دلفریب بنا دیتے۔ نہ صرف اندلس کی حسین فضا الشعر الطبیعی

ترقی کے اسباب مہیا کر رہی تھی بلکہ ان کے یہاں عیش و عشرت کی فراوانی، مال و دولت کی زیادتی اور وہاں کے لوگوں کی عاشقانہ طبیعت نے بھی الشعر الطبیعی کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ثابت ہوئی تھی۔ عیش و عشرت کی زیادتی اور مصائب و آلام سے نجات انسان کو لہو و لعب اور سیر و تفریح کی طرف لے جاتی ہے چنانچہ اندلسی شاعر بھی انھیں حالات میں زندگی گذار رہا تھا۔ ایک طرف شاعر عیش و عشرت و تفریح سے رہے تھے۔ دوسری جانب فکر سے نجات کی وجہ سے لہو و لعب کی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ فضا کی خوشگواری اور دولت کی فراوانی کے نتیجے میں عیش و آرام کے اسباب کا بسہولت مہیا ہو جانا، پر وقار تمدن کے شوق اور حسن کا تقاضا ان تمام چیزوں نے مل کر ایک نئی قوم کی تشکیل سے بھی الشعر الطبیعی کی ترقی کے اسباب مہیا کئے۔ انھیں سب اسباب کی بنا پر یہاں کے شعراء نے ایک امتیازی حیثیت پیدا کرلی۔ فطری طور پر یہاں کی شاعری میں رومانی احساسات کے اظہار کے ساتھ ساتھ خوش دلی اور خوشگوار زندگی کی عکاسی بھی ہے۔

اندلس میں الشعر الطبیعی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

(۱) پہلا دور: اموی بادشاہت سے شروع ہوکر ۱۰ویں صدی عیسوی کی ابتدا پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ابتدائی دور ہے۔ اس دور میں ابن ہانی، ابن عبد ربہ اور ابن دراج القسطلی مشہور شعراء گذرے ہیں۔

(۲) دوسرا دور: ۱۰ویں صدی کی ابتدا سے اس کے اختتام تک ہے۔ یہ دور اس حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں الشعر الطبیعی کی ایک مستقل شکل و صورت سامنے آتی ہے اور اس صنف سے بیرونی اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ شعراء نے اپنے اندرونی احساسات اور داخلی کیفیات کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فطرت سے اپنا تعلق بڑے حسین پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس دور کے مشہور شعراء ابن زیدون، المعتمد اور ابن حمدیس ہیں۔

(۳) تیسرا دور: ۱۱ویں صدی کی ابتدا سے مسلم حکومت کے انتہا پر ختم ہونے تک ہے۔ اس دور میں الشعر الطبیعی اپنے پورے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے افکار و خیالات تصورات و نظریات میں اور رنگ میں بھی تجدد پیدا ہوا۔ اس دور کے اہم شعراء میں ابن الخطیب، ابن خفاجہ اور ابن سہل خاص طور پر شعراء ہیں۔

الشعر الطبیعی کی اہم خصوصیات:-

اس میں:

(۱) اندلسی شاعر اپنے ماحول سے اپنے تعلق کو بیان کرتے ہوئے دوسرے تمام ماحول اور علاقوں سے اس کی فضیلت و برتری کا ظاہر کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے علاقہ اور اپنی بستی کے مطابق شاعری کرتا اور اپنے علاقہ کو جنت نظیر اور حسین تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ابن خفاجہ اندلس سے اپنے تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے اس کو خلد بریں بتاتا ہے۔ اندلس کی ہر چیز سے اس کو والہانہ لگاؤ ہے۔ ابن زیدون اور ابن حمدیس وغیرہ بھی اندلس سے اپنی وارفتگی کو بڑے حسین انداز میں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ الشعر الطبیعی کے اشعار وہاں کے فطری مناظر کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ شعراء طبیعیات اندلس کے کھیتوں، باغات، نہروں، پہاڑوں، وہاں کے آسمان اور ستاروں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اندلس کے محلات، مساجد تالابوں اور حوضوں وغیرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ وہاں کی خوبصورتی، اس کی عمارات اور دلفریب باغات دیکھ کر ان فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے محو ہو جاتے ہیں۔ فطرت ان کو ہنستی مسکراتی گنگناتی نظر آتی ہے۔

بعض شعراء اندلس کے علاوہ دوسرے ممالک کے حسین مناظر اور خوبصورتی پر بھی شاعری کرتے ہیں۔ ابن زیدون نے قرطبہ کی دلکشی پر شاعری کی۔ ابن سفر المرینی اشبیلیہ کے حسن پر گنگناتا ہے اور ابو الحسن بن نزار جو وادی رشات کا ہے اس کی ایک

دلکش تصویر کھینچتا ہے کہ اس کے سایہ دار درخت، شبنم اور نہروں کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔

(۴) فطرت ان کو ہر وقت مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے حسین مناظر سے فضا مسحور کن بنتی ہے اور اس کی تعریف شاعر اس طرح کرتا ہے کہ سارا سبزہ زار لہلہاتا ہوا نظر میں آ جاتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار اپنی تعریف کے ہوں یا خوشی کی تشبیہات اور آغوش قدرت میں ان کی پیروی و تعریف کے وصف بیان ہیں۔

(۵) فطرت کا وصف ان کے نزدیک غزل اور خمر سے متعلق ہے۔ وہ محبت کے احساسات کا اظہار صرف مناظر و مظاہر کے واسطے سے کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی غزل کو ایک دلکش نارنگ دیدیتے ہیں تاکہ فطرت سے متعلق جو تنہائیوں میں ان کی مونس اور مجالس لہو و سرود میں ان کی ساقی ہے، اپنے احساسات و تصورات کو آگے بڑھائیں۔ وہ جام پر جام لنڈھاتے ہوئے اور خوشیاں مناتے ہوئے شاعری کرتے ہیں۔ ابن زیدون، ابن حمدیس اور ابن خفاجہ وغیرہ نے اس قسم کی شاعری کی ہے کہ فطرت کو غزل اور خمریات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس کو طرب و موسیقی سے جوڑا ہے۔ اندلسی شعراء محبوب کی تعریف اس کے ماحول کی تعریف کے ذریعہ کرتے ہیں جو کہ اکثر فطرت میں ہوتا ہے۔ جبکہ مشرقی شعراء غزل میں مادیت، آپسی گفتگو اور ملاقات کا تذکرہ کرتے ہیں نیز جسمانی خط و خال کی تعریف میں مصروف رہتے ہیں۔

۷۔ ان کے نزدیک عورت فطرت کی خوبصورتیوں کا ایک جزو ہے اور فطرت، عورت میں اپنا سایہ اور حسن پاتی ہے اسی سے محبوبہ ایک باغ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ حتیٰ اندلسی شعراء کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"وہ جب غزل کہتے ہیں تو گلاب کے پھول کو رخسار، نرگس کو آنکھ، پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو ... سے، پیشانی کو سوسن، قد و قامت کو گلے، سامنے کے دانتوں کو بادام اور سیب کے اندر کی حفاظت سے اور لعاب دہن کو انگوری شراب سے تشبیہ دیتے ہیں۔"

اس طرح خوبصورت عورت اور فطرت کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ تھا۔ عورت کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ فطرت کا تذکرہ اکثر ہی ساتھ فطرت کا تذکرہ ان کے یہاں لازمی تھا۔

۸۔ شعراء طبیعہ فطرت کی منظر کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس طرح انسان کے دل میں حرکت و انبساط پیدا ہوتا ہے اسی طرح فطرت بھی خوشی و غم کے احساسات و جذبات سے متاثر ہوتی ہے جیسے ابن الخطیب کے اس شعر میں ہے۔

جادكَ الغيثُ إذا الغيثُ همى يا زمانَ الوصلِ بالأندلسِ
لم يكن وصلكَ إلا حُلُماً في الكرى أو خلسةَ المختلسِ

۸۔ الشعر الطبیعی میں صرف فطرت پر ہی شاعری نہیں ہوئی بلکہ اور بھی دوسرے موضوعات پر شاعری کی گئی ہے جن میں سب سے زیادہ غزل رہی جس کی وجہ اس کا فطرت سے ہم آہنگ ہونا ہے۔ اس کے بعد مدح، افتخار، فخر اور عتاب جیسے موضوعات پر بھی شاعری ہوئی۔ ابن زیدون، ابو الولید ابن جہور کے فضائل کا وصف سرسبز باغ سے کرتا ہے۔

للجهوريِّ أبي الوليدِ خلائقٌ كالروضِ أضحكهُ الغمامُ الباكي

ابن زیدون ہی اپنے ایک ساتھی ابو حفص بن برد پر خفا ہوتا ہے تو اپنا کے درخت اور سرسبزی کے جھڑ جانے سے تعبیر کرتا ہوا اس کو تنبیہ کرتا ہے۔

لا يكن عهدك وردا إن عهدي لك آسُ

۹۔ اندلس میں الطبیعۃ کے پورے شباب پر پہنچ جانے کے بعد موشحات کی ترقی کے اسباب پیدا ہوئے۔ اندلس کی بہار نگار فضا جس نے اپنے آغوش میں غزل، موسیقی اور الشعر الطبیعہ کو پروان چڑھایا تھا اب ایک ایسا شعری ڈھانچہ تیار کر رہی تھی جو ہر طرح سے جدید اور دلکش تھا اور جو اندلس کی فطرت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہا تھا اور اس کی عطر بیز خوشبو سارے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔

ابن خفاجہ اندلس کے قدرتی مناظر کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

يا أهلَ أندلسٍ للهِ درُّكمُ ماءٌ وظلٌّ وأنهارٌ وأشجارُ

بقیہ صفحہ [illegible]

م اسلام فلاحی

اورنگ زیب کے مذہبی رجحانات

مغلیہ سلاطین کے مشہور و معروف فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر ہی کی شخصیت ہمیشہ سے غیروں اور اپنوں کے درمیان وجہ اختلاف بنی رہی ہے، خصوصاً ان کے مذہبی رجحانات کو زیادہ نشانہ بنایا گیا، اور ہندوستان کی تاریخ میں ان کو ایک کٹر متعصب، اور ہندو کش فرماں روا کی شکل میں پیش کیا اور کچھ وہ لوگ تھے جو ان کی مدافعت میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے۔ اور بالآخر دونوں ہی نے تاریخی حقائق سے آنکھیں بند کر لیں۔ آئیے آج ہم تاریخ کے صفحوں پر حقائق کی جستجو کریں۔

اورنگ زیب تقریباً پچاس سال تک ہندوستان کے تخت و تاج کے مالک تھے۔ انھوں نے بھی کم و بیش اتنے ہی سال حکومت کی جتنے سال ان سے پہلے شہنشاہ اکبر نے کی تھی۔ ان کے عہد حکومت میں سلطنت مغلیہ اپنی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے اپنے طویل دور حکومت میں اپنی تمام تر توجہ امور ہائے حکومت کی طرف مبذول کی اور سلطنت مغلیہ کو اندرون و بیرون استحکام بخشنے کی کوشش کی اورنگ زیب اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت سخت واقع ہوئے تھے۔ وہ نظم کی خلاف ورزی کو سنگین جرم سمجھتے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اس کے لئے اپنے بیٹے کو بھی معاف نہیں کیا، اور شہزادہ معظم کو ۱۲ سال کی طویل مدت جیلوں کی سلاخوں میں گذارنی پڑی۔ اورنگ زیب کو دکھاوا، ریاکاری، نام و نمود اور شہرت بالکل پسند نہیں تھی، اس معاملے میں وہ اپنے پیشروؤں سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں ان کی زندگی میں سادگی تھی۔ گو وہ بادشاہ تھے، لیکن ایک عام آدمی کی طرح نچلی سطح کی زندگی گذارتے تھے۔

جیسا کہ مورخین اورنگ زیب کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہیں کچھ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اکبر کی مذہبی رواداری (Religious Toleration) کی پالیسی کو بالکل بدل دیا تھا، اور حکومت سے ہندوؤں کی وفاداری کو شدید نقصان پہنچایا جس سے ملک افراتفری سے دوچار ہوا اور حکومت کی چولیں ہل گئیں بالآخر سلطنت مغلیہ زوال و انحطاط کا شکار ہوئی۔ کچھ دوسرے مورخین ہیں جو ان کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کو خواہ مخواہ متہم کیا گیا ہے۔ حالانکہ بات دراصل یہ تھی کہ اورنگ زیب کے پیشروؤں کی لاپرواہی و بے اعتنائی کی وجہ سے ہندو بے وفا ہو گئے تھے لہٰذا اورنگ زیب کو ان سے نپٹنے کے لئے سخت طریقے اپنانے پڑے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ دونوں نظریوں کے اندر کس

ورنگ پائی ہے۔

گو اورنگ زیب اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں زیادہ سخت اور کٹر مسلمان تھا لیکن اس کے ساتھ وہ ایک حکمران بھی تھا وہ ملکی و سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور اس گمان کا بھی کوئی امکان نہیں کہ وہ ملکی سیاست اور جہاں بانی و جہاں داری کے فن سے ناواقف تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ نصف صدی تک اتنی کامیابی سے حکومت نہیں کر سکتا تھا وہ اس حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کی اکثریت کا ملک ہے، لہٰذا کوئی بھی پالیسی جس میں ہندوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہو زیادہ نہیں چل سکتی تھی اور نہ ہی حکومت کی مشینری صحیح ڈھنگ سے چل سکتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے اور ہر طرح کی مراعات دی گئیں ان کے ساتھ شادی بیاہ کی رسومات نبھا ہی گئے۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کر سکتے تھے یہاں تک کہ شاہی محلات کے اندر بھی ہندو بیگمات کو اپنے مذاہب کے مطابق رہنے اور پوجا پاٹ کی کھلی آزادی حاصل تھی۔ یہ اسی کھلی آزادی اور چھوٹ کا نتیجہ تھا کہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں وہ اتنے جری ہو گئے تھے کہ انھوں نے مسجدیں ڈھانا شروع کر دیں تھیں اور ان کی جگہوں پر مندر تعمیر کرا لئے تھے انھوں نے مسلم عورتوں پر زور زبردستی کی اور ان سے اپنے گھروں میں بیگار لینے لگے۔ ان کی آزادی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کی علالت کے زمانے میں جب دارا تخت و تاج کا مالک بنا دیا گیا تو ان کی آزاد خیالی اور رواداری کی وجہ سے انکی ہمت اور بڑھ گئی۔ اور اب وہ آزادی کے ساتھ فساد پھیلانے اور قتل و غارتگری کرنے لگے۔ ان چیزوں کا ثبوت ہم کو بادشاہ نامہ، آداب عالمگیری اور فرشتہ سے

تھا کہ حالات اتنے ناسازگار ہو گئے تھے کہ مسلمان جمعہ کی نماز بھی خانگاہی مسجدوں میں نہیں ادا کر سکتے اور عہد عالمگیری کے بارہویں سال تک یہی حالت رہا۔ ادھر مراٹھوں نے بھی سر اٹھایا اور ہندو سلطنت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔ اور مغلیہ حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مصروف عمل ہو گئے ان حالات نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو چوکنا بنا دیا اور مجبور کر دیا کہ اپنی پالیسی پہ نظر ثانی کرے اورنگ زیب کے سامنے مسئلہ مغلیہ حکومت کی حفاظت کا تھا مسئلہ مراٹھوں کو دبانے کا تھا اور مسئلہ عوام کی فلاح و بہبود کا تھا۔

جہاں تک عہد عالمگیری میں جزیہ کی دوبارہ بحالی کا تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کو متعصب اور تنگ نظر کا لقب دیا گیا ہے۔ جزیہ کی بحالی دراصل کسی عصبیت یا تنگ نظری کا نتیجہ نہیں تھی۔ اور نہ ہی جزیہ بذات خود کوئی ناجائز یا نامعقول ٹیکس ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت تو گویا ایک تحفہ کی ہے جو کہ ذمیوں سے ان کے جان و مال کے تحفظ کے طور پر لیا جاتا ہے اور زمانہ عالمگیری میں بھی ۱۶۷۹ء تک تقریباً بیس سال جزیہ نہیں بحال کیا گیا تھا۔ جزیہ کی بحالی تو ثانوی چیز تھی حکومت کے مسائل زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اورنگ زیب نے اپنی اولین توجہ امور حکومت کی طرف مبذول کی۔ اور اگر اورنگ زیب کے لئے حالات پہ قابو پانا آسان ہوتا تو وہ کبھی جزیہ بحال نہ کرتے۔ مگر چونکہ حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تھے لہٰذا اورنگ زیب کو جزیہ مجبوراً بحال کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سیاسی تھی اور معاشی نہ کہ مذہبی عصبیت جزیہ کی بحالی کے ذریعہ اورنگ زیب کا خاص مقصد مسلم وزرا کو خوش کرنا اور مراٹھوں کے مقابلے میں ان کا پورا اعتماد حاصل کرنا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے

کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ہندوؤں کے ذمہ سے تقریباً اسی قسم کے ٹیکسوں کو ساقط کر دیا تھا جو کہ ان کے پیشروؤں کے ذریعہ ان پر لاد دیئے گئے تھے یقیناً اورنگ زیب نے ایسا اس لئے کیا تھا کہ یہ تمام ٹیکس اصول اسلام کے خلاف تھے تو اس کی وجہ سے حکومت کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر جزیہ کی بحالی اورنگ زیب کی عصبیت اور تنگ نظری کو ثابت کرتی ہے تو اتنی اقسام کے ٹیکسوں کی معافی ان کی وسعت نظری اور آزاد خیالی کو ثابت کرتی ہے۔

عالمگیر پر دوسرا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے بیک جنبش قلم تمام ہندوؤں کو حکومت کے سروس سے خارج کر دیا لیکن یہ صریح جھوٹ ہے اور اسے تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہی کہی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سول اور ملٹری دونوں شعبوں میں ہندو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے یہاں تک کہ مختلف شعبوں کے گورنر بھی رہے۔ اگر اعداد و شمار کے ذریعہ بھی ہندو منصبداروں کا تناسب مختلف مغلیہ شہنشاہوں کے عہد میں معلوم کیا جائے تو اس طرح ہے۔ اکبر جہانگیر کے عہد میں ۲۱٪ شاہجہاں کے عہد میں ۲۱٪ فی صد اور عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے پہلے اور دوسرے دور میں یعنی ۱۶۵۸ء سے ۱۶۷۸ء تک ہندو منصبداروں کی تعداد ۲۱٪ فی صد اور تیسرے دور میں (۱۶۷۹ء تا ۱۷۰۷ء) ان کی تعداد بڑھ کر ۳۱ فی صد ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اورنگ زیب اپنے اس دور میں جس میں ان کو متعصب اور تنگ نظر کہا گیا ہے۔ زیادہ لبرل اور سیکولر تھے اور تمام دیگر مغلیہ شہنشاہوں کے مقابلہ میں زیادہ روادار تھے۔

۱۶۷۹ء میں راٹھوڑوں کی زبردست بغاوت شروع ہوئی اور اسی سال راجہ جسونت سنگھ مارواڑ کے راجہ کی موت ہوئی اور اس کا بیٹا اجیت سنگھ جو کہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا اسے راجہ نامزد کر دیا گیا تھا۔ کیا اسی وجہ کسی سیاسی مصلحت کے علاوہ بھی سمجھ میں آتی ہے؟

اورنگ زیب عالمگیر راجپوتوں کو بالکل نظر انداز نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے تاکہ وہ ان کے خلاف مرہٹوں سے مل کر ان کے ہاتھ مضبوط نہ کرنے پائیں۔

ایک دفعہ اورنگ زیب نے ایک فرمان جاری کیا کہ تمام ہندو کلرک، دیوان اور تحصیلیں خراج جو کہ غلط کار ہیں اپنے عہدوں سے برطرف کر دیئے جائیں۔ آخر یہ فرمان عالمگیر کے خلاف حجت کس طرح بن سکتا ہے۔ کوئی بھی حکمران غلط کاروں کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ مشکوک نگاہی کی وجہ سے بھی بڑے بڑوں کو اپنے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک اور الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ کہ انھوں نے ہندو رعایا کو تکلیفیں پہنچائیں اور مندر مسمار کئے۔ یہ صحیح ہے کہ عالمگیر اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ احترام کرتے تھے مذہب کے سلسلے میں ہندوؤں کا لحاظ رکھتے تھے اور قرآنی تعلیمات سے بھی صحیح ہے کہ لا اکراہ فی الدین دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ اور فرمان محمدی کے رو سے بھی کہ جو کوئی ذمی کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مجھے تکلیف پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد کہاں گنجائش رہ جاتی ہے اس یقین کی کہ انھوں نے ہندوؤں کو تکلیفیں پہنچائیں تھیں اور مندر مسمار کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہندوؤں نے بغاوت کی اور مسجدیں مسمار کیں اور مندر تعمیر کر لئے جو کہ بعد میں سیاسی سازباز کا مرکز بننے لگے تھے تو اورنگ زیب عالمگیر نے فرمان جاری کیا کہ ایسے تمام مندر توڑ ڈالے جائیں اسی طرح وہ مندر بھی جو شاہی اجازت کے بغیر تعمیر کئے گئے تھے لہٰذا یہ سوچنا غلط ہے کہ اورنگ زیب نے تمام مندروں کے توڑ پھوڑ کا عام حکم دے رکھا تھا۔

جہاں تک عالمگیر کے مذہبی اور اخلاقی ضوابط کا تعلق ہے تو سب سے پہلے انھوں نے سکہ پر کلمہ کندہ کرانا بند کیا انھوں نے نوروز منایا جانا بند کیا جو کہ زرتشتیوں کا عمل تھا۔

بقیہ صفحہ ۲۳

مولانا عبد الحسیب اصلاحی
صدر مدرس جامعۃ الفلاح

استقبالیہ کلمات

آپ کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے میری آنکھیں بھر آئیں

حضرات اساتذہ کرام، مہمانانِ گرامی اور قدیم و جدید طلباء

میں اپنی جانب سے، اپنے رفقائے کار کی جانب سے، آپ کی اس مادرِ علمی کی جانب سے آپ طلبۂ قدیم کو اس کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جامعہ کی زندگی میں صبحیں بہت سی آئیں، شامیں بہت سی گزریں، اگر میں اس صبح کو صبحِ عید سے تعبیر کروں تو مبالغہ نہ ہوگا، شام ہی سے جب آپ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک اٹھے ہیں، آوازیں رندھتی گئی ہیں، اور یہ خوشی کوئی مصنوعی خوشی نہ تھی فطری تھی اور جذباتی بھی تھی۔ ایک ایسا ماحول، ایک ایسا ادارہ جہاں آپ نے زندگی کے قیمتی ایام گزارے ہیں جہاں آپ نے کئی سال صرف کئے ہیں اور پھر بعد از فراغت کوئی زیادہ دنوں سے اور کوئی کچھ دنوں سے اپنے اپنے ماحول میں اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے۔ جب ان سے بات چیت کا موقع ملا ہے تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو کا چھلکنا ایک فطری بات ہے۔ آپ نے یہ کنونشن منعقد کر کے، آپ کا یہاں اکٹھا ہو جانا، آپ کو دیکھ کر آنکھوں کا روشن ہونا دلوں کا شاد ہونا یہ ایک ایسا موقع ہمارے لئے نصیب ہو گیا ہے جس پر میں دلی اظہارِ مسرت کرتا ہوں اور آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ خوشی بالکل فطری ہے جیسے کہ جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو مدتِ دراز کے بعد دیکھے۔ ایک ادارہ اپنے نونہال فارغین کو ایک عرصہ کے بعد دیکھے، ایک ادارہ اپنی کاوشوں کو اپنے ثمرات کو اپنی آنکھوں سے دوبارہ دیکھے، بالکل یہ خوشی ویسی خوشی ہے جہاں یہ کنونشن اپنے دامن میں ہزار خوشیاں لئے کھڑا ہے

جہاں یہ صبح جامعہ صبحِ عید بن کر طلوع ہوئی ہے جہاں ہمارے لئے ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں وہیں غم بھی پیچھے سے دستک دیتا آتا ہے۔ میرا اشارہ استاذ محترم مولانا جلیل احسن ندوی کی وفات کی طرف ہے جن کی قابلیت کا، جن کی بزرگانہ حیثیت کا، جن کی پدرانہ شفقت کا، جن کی عالمانہ مہارت کا سبھی کو اعتراف ہے مگر قدرت کے آگے سب بے بس ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت سب پر حاوی ہوتی ہے۔ استاذ محترم کا سانحۂ ارتحال ہماری زندگی کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ اور جامعہ کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مگر راضی برضائے مولیٰ، اللہ موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دوسری طرف ہمارے محترم ساتھی جو روزِ اول سے اس کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے جن کی رات دن کی محنتیں اس کی ترقی میں برابر نظر آتی ہیں۔ میرا اشارہ رفیقِ محترم مولانا شبیر احمد اصلاحی کی طرف ہے کہ وہ کچھ نادانوں کی نادانی کا شکار ہو کر کے بہت حد تک مجبور سے ہو گئے ہیں جامعہ کی خدمت سے باوجود خواہش کے، وہ معذور سے ہو گئے، بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب وہ رو بصحت ہیں۔ کبھی کبھی آکر درجات میں بیٹھتے بھی ہیں۔ اپنے درس سے طلبہ کو مستفید بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحتِ عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔

حضرات! کنونشن اس دور کا ایک فیشن ہے۔ کنونشن ہوتے رہتے ہیں اگر اس کو فیشن کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا لیکن اس کے علی الرغم یہ ایک ضرورت بھی ہے اسکی اہمیت بھی ہے اور اس کی افادیت بھی ہے۔ آپ حضرات بعد از فراغت اپنے اپنے حلقوں میں گئے، اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے

مطابق اپنے اپنے حلقوں میں کام کرتے رہے پھر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ آپ پراگندگی کا شکار ہو گئے ہوں، آپ نے اپنے آپ کو تشکیل بھی منظم کیا اور تشکیل کونسل اپنے کو مجتمع کیا ایسا ہونا بھی چاہیے تھا یہ اسی ادارہ کا عین تقاضہ تھا اس کے مطلوبہ مقاصد کیلئے یہ سب سے کامیاب طریقہ ہے یہ ادارہ جیسے علماء فضلاء تیار کرنا چاہتا ہے جیسے علماء پیدا کرنا چاہتا ہے، جیسے خدام دین جیسے تحریک اسلامی کے افراد تیار کرنا چاہتا ہے ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ یہاں سے فارغین یہاں سے فارغ ہو کر ملک ملک میں جا کر گم نہ ہو جائیں بلکہ جہاں بھی جائیں وہ اپنی روشنی جو انہوں نے یہاں سے حاصل کی ہے چند سالوں میں جو کسب فیض کیا ہے جو علم کتاب حاصل کی ہے، جو معارف دین حاصل کئے ہیں اس سے دنیا کو مستفید کریں اور پھر اپنے تجربات لئے ہوئے اپنے مسائل لئے ہوئے یا اپنی ناکامیوں اور پریشانیوں کو لئے ہوئے کبھی کبھی یہاں اکٹھا ہو جایا کریں، سر جوڑ کر بیٹھا کریں اور ان پر غور کریں، اور ان کے ازالے کی اور اپنے کام کو بیش از بیش آگے بڑھانے کی فکر کریں اگر یہ دیکھا جائے تو اس پہلو سے یہ کونسل ایک عین ضرورت بن جاتا ہے یہ فیشن نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ بہت اہم تقاضہ بن جاتا ہے اور اسی لئے اس کے انعقاد پر ہمیں دلی مسرت ہے۔ یہ آپ کا دوسرا کونسل ہے اس کے بعد اور بھی کونسل آئیں گے، آگے رہیں کامیاب سے کامیاب تر ہوتے رہیں۔ اس بار آگئے ہیں اور دو سال کے وقفہ کے بعد یہاں اکٹھے ہوئے ہیں اس عرصہ میں جو کام آپ نے کئے ہوں گے، آپ نے جو علم یہاں سے حاصل کیا ہے اپنی قوم کو، اپنے لوگوں کو، انسانیت کو اس سے فیض پہونچایا ہوگا۔ آپ کے نتائج آپ کی کاوشیں ہم سننے کے منتظر ہیں اور ان کو شوق سے سنیں گے، آپ کی مشکلات بھی سامنے آئیں گی، اس سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ کچھ ہماری کوتاہیوں کا دخل رہا ہو، ہو سکتا ہے کہ ہم ناچیز خدام آپ کی کما حقہ تعلیم و تربیت نہ کر سکے ہوں یہ عین ممکن ہے بلکہ ممکن ہے۔ ایسا ہے کہ اب تو نہ ویسے علماء رہ گئے نہ وہ جہاں دیدہ علماء رہ گئے جن کے فضل و کمال کا ڈنکا بجتا ہو۔ کچھ ناچیز خدام ہیں جو یہاں آپ کی تعلیم کے لئے اور خدمت کے لئے اکٹھا ہو گئے ہیں یہ آپ کی سعادت مندی ہے کہ آپ نے جو کچھ سیکھا ہے، اسے دلوں میں زندہ رکھا ہے، آپ اس پر عمل پیرا ہیں اس کو عام کرنے کے لئے کوشاں ہیں اور یہ مزید باعث اطمینان اور باعث مسرت ہے اس لئے میں آپ کو اس کونسل کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس بات کی توقع رکھتا ہوں کہ آپ کو میدان عمل میں جن مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس سلسلے میں ہماری جن کوتاہیوں کا پتہ چلے گا ان کے ازالے کے ہم حتی المقدور کوشش کریں گے اس سلسلے کہ ہماری یہی خواہش ہے کہ ہم ایسے فارغین تیار کر سکیں جو قرآن و سنت پر گہری نظر رکھتے ہوں مسائل عالم پر جن کی گہری نظر ہو، اسلام پر ہونے والے اعتراضات اور پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کے ازالے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس سلسلے میں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کر رہے ہیں ہم آپ کے مشورے کے منتظر رہیں گے اور ان مشوروں کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل میں اپنے نصاب تعلیم میں، اپنے نظام تعلیم و تربیت میں ضروری اور مناسب تبدیلیاں بھی لائیں گے اور بہرحال اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنے محدود وسائل کے باوجود جو کچھ بھی ہم کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں گے۔ آپ کی یہ زندہ دلی، آپ کی حرکت اور آپ کی یہ سعادتمندی ہمارے حوصلوں کو بڑھاتی ہے۔ آپ کی آمد ہمارے حوصلوں کو بڑھا رہی ہے اور ہماری خوشیوں میں اضافہ کر رہی ہے۔ اس سرزمین پر بہت سے ادارے ہیں۔ اس سرزمین پر صدہا فارغین مختلف اداروں کے پھیلے ہوئے ہیں لیکن بہت سے ادارے یہاں ایسے بھی ہیں جہاں کے فارغین کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ یہ میری سعادتمندی ہے اور اس ادارے کی خوش نصیبی ہے کہ یہاں کے فارغین گو کہ تعداد میں دو سو سے کچھ ہی زائد ہوئے ہیں لیکن بہرحال وہ ابھی سے، آغاز کار ہی سے منظم ہو گئے ہیں اور یہ ان کی سرگرمی عمل اور ان کا ایک لڑی میں پرو جانا اور مقاصد ادارہ کو روبہ عمل لانے کے لئے کوشاں اور فکرمند رہنا کونسل کا انعقاد کرنا اور اسے روبعمل لانا اس ادارے کیلئے فال نیک ہے فارغین کی بہت سے ہمارے لئے باعث مسرت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہاں خوشی ہوئی ہے وہیں آپ کے جذبات کا اندازہ کر سکے آپ کی خدمات کا اندازہ کر کے مزید مسرت ہوتی ہے۔ اللہ آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے آپ کی کوششوں سے آپ کی حوصلہ افزائیوں سے آپ کے جدید ساتھیوں کو بھی حوصلے اور آپ

بقیہ صفحہ ۴۹

عبدالعزیز یمنی

اسلام سے پہلے عربوں کے مذہبی عقائد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب معاشرے کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ زمین کا یہ حصہ تاریکی، جہالت اور شرک و بت پرستی میں باقی دنیا سے بہت آگے تھا۔ بت پرستی کو ایک پرستش و عبادت سمجھا جاتا تھا۔ جہالت پرستی غرض ایک خدا کے سوا جتنی پرستیاں پائی جاتی تھیں وہ سب ان میں موجود تھیں۔ یوں تو کعبہ اس وقت تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا لیکن ان میں چار بت سب سے زیادہ مشہور و ممتاز تھے۔

۱۔ لات

اس کا استھان طائف میں تھا اور بنو ثقیف کے لوگ اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ ابرہہ جب ہاتھیوں کی فوج لے کر بیت اللہ شریف کو ڈھانے کے لئے مکہ پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا تو ان لوگوں نے محض اپنے اس معبود کے آستانے کو بچانے کے لئے اس ظالم کو مکہ کا راستہ بتانے کے لئے رہبر تک فراہم کئے حالانکہ اور لوگوں کی طرح ثقیف کے لوگوں کو بھی یہ معلوم تھا کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور اس کی حفاظت اولین فریضہ ہے۔

ابن جریر طبری کی تحقیق کے مطابق یہ اللہ کی تانیث ہے یعنی اصل میں یہ اَللّٰهَةُ تھا جو بدل کر اللات ہو گیا۔ زمخشری کہتے ہیں کہ یہ لفظ لَوٰی سے مشتق ہے جس کے معنی مڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین مکہ اس کی عبادت کرتے، اس کے لئے قربان کرتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لئے اللات کہا گیا۔

۲۔ عزّیٰ

یہ عزت سے ہے جس کے معنی عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی جس کا استھان مکہ اور طائف کے بیچ وادی نخلہ میں حراض کے مقام پر تھا اور بنو ہاشم کے حلیف بنو شیبان اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی سب سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ جب ابو احیحہ مرنے لگا تو ابولہب اس کی عیادت کرنے گیا۔ دیکھا کہ رو رہا ہے۔ پوچھا: کیا بات ہے ابو احیحہ۔ کیا موت کے ڈر سے رو رہے ہو؟ کہا: نہیں میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عزّیٰ کی پوجا کیسے ہو گی۔ ابولہب نے کہا: تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر اس بت کی پوجا ہوتی تھی نہ تمہارے بعد وہ چھوڑا جائے گا۔ تب ابو احیحہ نے کہا: اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالے گا۔

۳۔ مناۃ

اس کا استھان مکہ اور مدینہ کے بیچ میں بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر واقع تھا اور بنو خزاعہ اور اوس و خزرج کے لوگ اس کے بہت زیادہ معتقد تھے۔ وہ اس کے آگے نذرانے پیش کرتے اور اس کا طواف کیا کرتے تھے۔ حج کے دنوں میں حجاج بیت اللہ، عرفات اور منیٰ سے فارغ ہوتے تو یہاں سے اس کا طواف اور زیارت کے لئے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں۔ جو لوگ پہلے سے اس کی زیارت کی نیت کر لیتے تھے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی ترک کر دیتے تھے۔

۴۔ ہبل

یہ سب سے بڑا دیوتا تھا جو انسانی شکل میں تھا اور کعبہ کے بیچ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں سات تیر سیدھے رکھے ہوتے تھے جن کا قرعہ ڈال کر یہ فال نکالتے تھے اور پیش گوئی کرتے تھے۔ ابن ہشام کی روایت کے مطابق عمرو بن لحی یہ بت عراق عرب سے لایا تھا۔

ان کے علاوہ ود، یغوث، یعوق، نسر وغیرہ بہت سے دیوی دیوتا

جن کی تفصیل طوالت کا باعث ہو جائے گی۔

خدا کا تصور

بتوں سے یہ عقیدت اس وجہ سے تھی کہ ان کا عام تصور تھا کہ خدا ایک روحانی ہستی ہے جو بلا واسطہ اور جنات و ملائکہ کے ذریعے ہی ممکن ہے چنانچہ ان کو خوش کرنے کے لئے وہ اپنی عبادت دریافت پرستش اور قربانیوں میں ان کو شریک کرتے تھے۔ لیکن عربی جاہلی اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ اصل کائنات کا خالق اللہ ہے۔ وہی مربی اور منتظم ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں کو ٹالنے والا بھی وہی ہے چنانچہ جب کوئی آفت آتی، کسی مصیبت میں وہ گھر جاتے تو سارے دیوی دیوتا ان کو بھول جاتے اور وہ خالص خدا کو پکارتے۔ قرآن میں سورہ یونس کی آیات ۲۲ تا ۲۳ میں مشرکین مکہ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ:

جب تم لوگ باد موافق پر فرحاں و شاداں کشتی پر سفر کر رہے ہوتے ہو اور یکایک باد مخالف کا زور ہوتا ہے اور موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ اب طوفان میں گھر گئے تو اس وقت سب اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا کرتے ہیں کہ اگر اس بار آپ نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے لیکن جب وہ اس مصیبت سے بچ کر نکل آتے ہیں تو سرزمین میں ناحق سے منحرف ہو کر خدا سے بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

حج بیت اللہ

زمانہ جاہلیت میں بھی عرب خانہ کعبہ کا طواف اور حج بیت اللہ کرتے تھے لیکن اس خالص روحانی اور مذہبی معاملے میں بھی ساری بدعتیں اور خرابیاں گھس آئی تھیں۔ مثال کے طور پر قریش نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ جو لوگ طواف کرنا چاہیں وہ ان سے کپڑے حاصل کریں ورنہ برہنہ طواف کریں یا جن کپڑوں میں طواف کریں انھیں طواف کے بعد اتار پھینکیں۔

قریش نے خانہ کعبہ کا مذہبی نظام بہت اچھا کر رکھا تھا۔ تقسیم کے مطابق مندرجہ ذیل مناصب قائم کئے ہوئے تھے:

۱۔ سدانت : بیت اللہ کی رکھوالی اور پروہت۔

۲۔ سقایت : حاجیوں کو پانی پلانا۔ زمزم کی دوبارہ کھدائی سے پہلے مشکیزوں میں پانی بھر کر مکہ لایا جاتا تھا۔

۳۔ رفادت : حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ قریش اس کے لئے اپنے قبیلہ والوں سے ایک قسم کا ٹیکس بھی لیتے تھے۔

۴۔ عمارت : خانہ کعبہ کی عمارت کی دیکھ بھال اور اس کا جائزہ کہ حدود حرم میں ہنگامہ، شور و غل، دنگا اور ظلم کی طرح نہ ہو پائے۔

۵۔ اموال محجرہ : ان اموال کی حفاظت جو کعبہ پر چڑھائے جاتے تھے۔

۶۔ حجابت : کلید برداری اور دربانی۔

۷۔ نسی : قمری مہینوں کو کبیسہ کر کے شمسی بنانا۔

مذہب کے اثرات

بتوں سے اس درجہ عقیدت اور تعصب کی حد تک محبت میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ عملی زندگی میں ان کے اثرات سے تقریباً محفوظ تھے محض تقلید جامد اور رسم کہنہ کے احترام کے پیش نظر وہ تھوڑی بہت مذہب کی پابندی کر لیتے تھے۔

ایک عام عرب کے دل میں ان بتوں کی جو کچھ وقعت اور عزت باقی جاتی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگا لیجئے کہ جب کبھی ان کی تمناؤں اور خواہشات کے خلاف فال نکلتا تو وہ بتوں کی توہین کر ڈالتے اور نذرانے سے ہاتھ کھینچ لیتے تھے۔

امراء القیس نے جب اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینا چاہا تو ذوالخلصہ نامی بت کے آستانے پر گیا اور فال نکلوائی جس میں اسے انتقام لینے سے منع کیا گیا تو وہ طیش میں آ گیا اور کہنے لگا۔

لو کنت یا ذا الخلص الموتورا   مثلی وکان شیخک المقبورا

لم تنہ عن قتل العداۃ زورا

یعنی اے ذوالخلصہ! اگر تو میری جگہ ہوتا اور تمہارا باپ قتل کیا گیا ہوتا تو تو یہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ انتقام نہ لیا جائے۔

ایک اور عرب سعد نامی بت کے آستانے پر اپنے اونٹوں کو برکت حاصل کرنے کے لئے لے گیا۔ بت کافی لمبا تڑنگا اور نذرانے کے خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اونٹ بدک گئے اور تتر بتر ہو گئے۔ اس پر وہ عرب بہت ناراض ہوا۔ وہ بت کو مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا: "اس بت کے پاس میں آیا تھا برکت کھینچنے کے لئے اور تو نے میرے رہے سہے اونٹ

بھی بھگا دیتے"۔ پھر وہ دو بتوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، بڑی مشکلوں کے بعد سے اونٹ ملے۔ آخر میں اس نے اس بت کے بارے میں یہ اشعار کہے:

أتينا إلى سعدٍ ليجمع شملنا — فشتّتنا سعدٌ فلا نحن من سعدِ
وهل سعدٌ إلا صخرةٌ بتنوفةٍ — من الأرض لا تدعو لغيٍّ ولا رشدِ

یعنی ہم سعد کے پاس جمع حال کے لئے آئے تھے اور اس نے ہمیں پراگندہ کر دیا۔ تو ہمارا سعد سے کوئی تعلق نہیں اور سعد کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ چٹیل میدان کا ایک معمولی پتھر ہے جو کسی کو گمراہ کر سکتا ہے نہ ہدایت دے سکتا ہے۔

ان دو بتوں کے بارے میں یہ تصور تھا کہ یہ مرد و عورت تھے جو خانہ کعبہ میں زنا کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے چنانچہ ان کی تصویریں خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی گئیں۔ اب بتائیے ان معبودوں کے بارے میں یہ تصور ہو ان کے سلسلے میں گہری عقیدت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے گہری عقیدت کے باوجود ان کی زندگی ان کے اثرات سے تقریباً خالی تھی۔

مظاہر پرستی

دوسرے مذاہب کی طرح مشرکین عرب کے ہاں بھی مظاہر پرستی عام تھی۔ انھوں نے ریگستان اور نخلستان کے درمیان عظیم فرق دیکھ کر دو طاقتوں کا احساس کیا۔ نخلستان کی سرسبزی و شادابی میں انھیں خدائے برتر و رحمت کا عکس نظر آیا اور ریگستان انھیں شیطان کی کارستانی معلوم ہوا۔

دہریہ

مشرکین کے علاوہ عربوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو موت و حیات رسول و خدا وغیرہ ، اور الطبیعت قوتوں کا منکر تھا۔ لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ انہیں پر تبصرہ کیا ہے قرآن نے اور ان کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

ما ہی إلا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین

اور

إن یہلکنا إلا الدہر وغیرہ

حنفاء

لیکن خال خال ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو اصل دین ابراہیم پر قائم تھے، توحید ہی کو راہ نجات سمجھتے تھے اور شرک و بت پرستی سے بیزار تھے۔ تاریخ میں تقریباً ایسے بارہ تیرہ افراد کے نام آتے ہیں۔ ورقہ بن نوفل جنھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت کے وقت ڈھارس بندھائی تھی، انھی دین حنیف کے پیروکاروں اور شرک سے بیزار لوگوں میں سے تھے۔

لیکن پورے عرب کی عمومی صورتحال وہی تھی جس پر قرآن نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

واذكروا نعمة الله عليكم إذ كنتم أعداءً فألّف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته إخوانًا وكنتم على شفا حفرةٍ من النار فأنقذكم منها۔

بقیہ صفحہ ۱۰

اور سلطنت مغلیہ میں مروّج ہو گیا تھا عالمگیر نے تمام صوبوں میں محتسب معین کئے جو کہ لوگوں کی عام زندگی پر نظر رکھتے تھے کہ آیا ان کی زندگی شریعت کے مطابق گذر رہی ہے یا نہیں ان کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ شراب اور تمام نشہ آور چیزیں لوگوں کے استعمال میں نہ آئیں۔ اورنگ زیب نے جھروکہ کا درشن موقوف کر دیا تھا جو کہ ایک نامعقول عمل تھا اسی طرح انھوں نے اپنے آپ کو اس عمل سے بھی باز رکھا کہ شہنشاہ سونے اور چاندی کے عوض تولا جائے۔

لہٰذا اورنگ زیب نے حکومت مغلیہ کے بنیادی ڈھانچے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ جو طریقہ پہلے سے چلا آرہا تھا۔ وہ اسی شکل میں باقی رہا البتہ کچھ اصلاحات اس کے اندر ضرور ہوئیں۔ اور ان اصلاحات کی بنیاد پر یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے حکومت میں بنیادی تبدیلیاں کر دی تھی۔

اخوان کے مرشد عام جناب عمر تلمسانی کا ایک انٹرویو

منزل انہی کو ملتی ہے

جو صبح کیساتھ راستے پر گامزن رہتے ہیں

"اخوان المسلمون" تجدید و احیائے دین کے لئے تقریباً نصف صدی سے کام کر رہی ہے۔ اس عرصہ میں اس جماعت کو مختلف اور متعدد مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بیشمار واقعات و حادثات اور جس بھیانک دور سے یہ جماعت گزری ہے شاید ہی کسی دوسری اسلامی تنظیم کو گزرنا پڑا ہو۔ اس تحریک نے اسلام کی سربلندی کے لئے امام حسن البنا شہید، عبدالقادر عودہ شہید، سید قطب شہید، حسن الہضیبی شہید، یوسف طلعت، فرغلی علی شہید اور ان گنت دوسرے شہداء کے خون کے نذرانے پیش کئے اور ہزاروں نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں نے برسہا برس جیلوں میں بسر کئے، اس کے باوجود آج بھی یہ تحریک نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کے کام اور پروگرام میں برابر اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

اس وقت اخوان المسلمون باقاعدہ ایک قانونی تنظیم کی صورت میں کام نہیں کر رہے ہیں لیکن تحریک اور دعوت کی حیثیت سے ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ جناب جسٹس عمر تلمسانی حفظہ اللہ اس تحریک کے قائد ہیں اور اخوان کے ماہوار مجلہ "الدعوة" کے چیف ایڈیٹر اور نگران بھی۔ ان کی عمر ۷۵ سال سے متجاوز ہے۔ وہ ۴۸ سال سے اخوان کی دعوت تحریک اور تنظیم سے وابستہ ہیں ۔۔۔ امام حسن البنا شہید نے ۱۹۲۸ء میں جب عرب جمہوریہ مصر کی راجدھانی قاہرہ میں اخوان المسلمون کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت جناب عمر تلمسانی فواد یونیورسٹی موجودہ قاہرہ یونیورسٹی کے لاء کالج سے ابھی نئے نئے فارغ ہو کر وکالت کرنے لگے تھے اور حضرت امام حسن البنا شہید کی دعوتی تقاریر میں شریک ہو کر اخوان کی دعوت کا مطالعہ کرتے رہے جب ان کو یقین ہو گیا کہ موجودہ تحریک ہی مصریوں کو نجات دلا سکتی ہے تو آپ باضابطہ طور پر اخوان کے رکن بن گئے اور چند ہی روز بعد امام حسن البنا شہید نے آپ کو اخوان المسلمون کے شعبہ دعوت و ارشاد کا رکن اعلیٰ بنا دیا۔

اخوان نے ۱۹۳۳ء میں اپنا ایک مستقل رسالہ "الدعوة" جاری کیا تو آپ اس کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں اور ۱۹۳۴ء سے لے کر آج ۱۹۸۰ء تک مسلسل "الدعوة" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اخوان المسلمون کے پیغام کو دنیا میں پہنچا رہے ہیں۔ آپ کے آباء و اجداد الجزائر سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہو گئے تھے اور آپ ۱۹۰۴ء میں مصر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں ان میں "شہید المحراب عمر بن الخطاب"، "الملہم الموہوب استاد الجلیل حسن البناء" سر فہرست ہیں۔

آپ مختلف ادوار میں ۱۷ برس سے زیادہ عرصہ مصر کی جیلوں میں رہے۔ مصر کے انتہائی جنوب سے لیکر انتہائی مغرب تک کوئی جیل ایسی نہیں جس میں آپ نہ رہے ہوں۔ عمر کے اس حصہ میں آج بھی اپنے دعوتی کام اور پروگرام میں منہمک ہیں اور قاہرہ جیسے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ دور دراز دیہاتوں تک میں بھی اسلامی دعوت پیش کرتے اور لوگوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت اور

دین کی سربلندی کی طرف بلاتے رہتے ہیں۔ میں راقم الحروف جناب عمر تلمسانی کی تقریر بارہا سن چکا ہوں، جب میں قاہرہ میں ازہر یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا تو ازہری طلبہ کی "تنظیم الجماعات الاسلامیہ" جناب تلمسانی صاحب کو خطاب کے لئے بلاتی رہتی تھی اسکا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

آزمائشوں سے سبق

اخوان المسلمون کے مرشد عام جناب محترم عمر تلمسانی صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

جماعت جن آزمائشوں سے گزر رہی ہے ان سے جماعت نے اور جماعت کے رہنماؤں نے بے شمار سبق سیکھے اور بہت سے نتائج اخذ کئے ہیں جن میں بعض درج ذیل ہیں۔

(۱) اسلام کے دشمن اسلام کے علمبرداروں پر جو بہتان باندھنا چاہیں باندھ لیں مگر حقیقت آخر کار کھل جاتی ہے اخوان المسلمون کے معاملہ میں یہی کچھ ہوا۔

(۲) اللہ کے راستے میں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ جدوجہد کے اثرات جدوجہد کرنے والا اپنی اس زندگی میں ضرور محسوس کرتا ہے۔

(۳) دنیا اور اس کے ٹھاٹھ باٹھ کی بے بضاعتی کا یقین پیدا ہوا۔

ابتلاء کا یہ طویل دور گزر گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چند لمحے تھے جو تیزی سے گزر گئے اور بس ان کی یادیں باقی رہ گئیں۔

عربی اخبار "الشرق الاوسط" کے نمائندہ قاہرہ نے الاخوان المسلمون کے مرشد عام سے مختلف سوالات کئے تھے جن کے انہوں نے نہایت ہی تفصیل سے جواب دیئے ہیں۔

اخوان کے اغراض ومقاصد

پہلا سوال یہ تھا اخوان المسلمون کے بنیادی اغراض ومقاصد کیا ہیں؟

ج: اخوان کے بنیادی اغراض ومقاصد یہ ہیں کہ لوگ اپنے رب کو پہچان لیں اور ان کے اندر ایسی اعلیٰ روحانیت پیدا ہو جائے کہ وہ مادیت کی بیڑیوں سے آزاد ہو جائیں پھر وہ انتہائی پاکیزہ بلند انسانیت کی آغوش میں اطمینان کا سانس لیں اور اس کے جمال ودلکشی سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔

اخوان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ القرآن الکریم ہی تمام امت اسلامیہ کا بنیادی دستور ہے اور قانون ہے اور اس کے خلاف جو انسانی قانون ہیں ان میں انسان کی فلاح نظر نہیں آتی اسی طرح اخوان کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ ہر اس اسلام دشمن نظریے اور افکار کا قلع قمع کیا جائے جو مختلف ناموں مثلاً سیکولرزم، کمیونزم وغیرہ کے نام سے ہمارے یہاں وارد ہو رہے ہیں ان کو کچل دیا جائے۔ اور اسی طرح ہر اس استعمار کا سختی سے مقابلہ کیا جائے جو مسلمانوں کی سرزمین پر زبردستی قابض ہو کر مسلمانوں کو بے دخل کر رہے ہیں۔ ہم اخوانیوں کا نعرہ ہے۔ "اللہ غایتنا" اللہ ہی ہماری غایت ہے اور یہ ہمارے دلوں سے نکلا ہوا نعرہ ہے۔ ہماری دعوت کا اولین مقصد یہ ہے کہ لوگ ازسرنو خدائی تعلق کو یاد کریں جس سے غافل ہو کر آج وہ خود فراموشی کا شکار ہیں۔

الرسول زعیمنا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے قائد ہیں۔

القرآن دستورنا: قرآن کریم ہمارا دستور اور قانون ہے

الجہاد سبیلنا: اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہمارا مقصد ہے۔

بعض حلقوں کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ اخوان المسلمون کے لوگ حکومت کے خلاف کام کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اخوان کبھی بھی نفس حکومت کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس قاعدہ کی مخالفت کرتے ہیں جو حکومت کو چلانے کیلئے وضع کیا گیا ہے اور جب حکومت اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق چلائی جا رہی ہو تو اخوان کو ایسی حکومت کی مخالفت کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ اخوان کے لوگ حکومت کے قوانین کو دیکھتے ہیں نہ کہ حاکم کو اور یہی اخوان

کی غایت اور مقصد ہے۔

حکومت کی پابندیاں اور اخوان

اخوان المسلمون کے مرشد عام سے جب دوسرا سوال پوچھا گیا کہ ابھی ابھی مصر کی حکومت نے ایک نیا قانون جاری کیا ہے جس کی رو سے ہر اس اخبار یا رسالہ پر پابندی لگادی جائے گی جو حکومت کے خلاف لکھتے رہے ہیں یا جن کا سرکاری طور پر ڈیکلریشن نہیں ہے اس قانون کی رو سے اخوان کا مجلہ الدعوۃ پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؟

ج: اخوان المسلمون ایک دعوتی تنظیم ہے اور اس جماعت کے لوگ اپنے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کے لئے کوئی متبادل راہ نکال سکتے ہیں اور ایسے مقاصد اور پروگرام میں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ آج پوری دنیا میں اخوان المسلمون موجود ہیں۔ اگر کسی ایک ملک میں انکی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیش آتی ہے تو وہ دوسرے ملکوں میں پیش قدمی کررہے ہوتے ہیں۔ یہ تصویر کا پہلا پہلو ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اخوان کو ساری فکر اس بات کی ہے کہ اللہ کے دین کے بارے میں اپنا فرض ادا کریں۔ باقی رہ گئے نتائج تو وہ اللہ کے سپرد ہیں۔ وہ جو نتائج پیدا کرنا چاہے وہ ہو کر رہتے ہیں۔

اخوان کے طریقۂ کار پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

اور حقیقت یہ ہے کہ اخوان کا مقصد اعلیٰ کلمۃ اللہ ہے جس کے لئے انہوں نے اللہ سے عہد کیا ہوا ہے چاہے حالات کیسے بھی ہوں اخوان کو اپنے دعوتی پروگرام سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ کیا آپ کے علم میں نہیں ہے کہ مصر کے سابقہ ادوار میں بالخصوص ناصری حکومت میں ۱۹۵۴ء سے لیکر ۱۹۶۵ء تک گرفتار کئے جانے والے اخوانیوں کی تعداد اسی ہزار تک پہنچ گئی تھی ان میں بچے، عورتیں، بوڑھے، نابینا، ڈاکٹرز، انجینئرز، استاد اور صحافی بھی شامل تھے ان میں سے صرف ایک ہزار افراد پر مقدمہ چلایا گیا جبکہ باقی لوگ بغیر مقدمہ ہی کے مصری جیلوں میں بند رہے۔

اخوان کے لوگوں کی منقولہ و غیر منقولہ ذاتی جائدادیں انکی کمپنیاں [illegible] دکانیں ان کے مدرسے اور کلینک انکی فیکٹریاں اور ورکشاپیں اور ان کے مکان اور زمینیں ضبط کرلی گئیں۔ عہد مظلومی میں اخوان کے حق میں کوئی بات کہنا بلا کو دعوت دینا تھا ان حالات میں بھی اخوان کی دعوت نہ رک سکی تو کیا اس مجلہ الدعوۃ کی پابندی سے رک سکتی ہے؟؟ اللہ تعالیٰ ہی کوئی بہتر راستہ اور سبب پیدا کرنے والا ہے۔

س: مصر میں اخوان المسلمون پر قانونی پابندی لگائے ہوئے آج ۲۰ سال ہوگئے۔ اس کے باوجود یہ کہنا صحیح ہے کہ آج بھی اخوان ایک بڑی طاقت رکھتے ہیں

ج: ہمارے یہاں تشکل اور موضوع میں تھوڑا سا فرق ہے تشکل کے اعتبار سے تو مصری قانون میں تو ہمارا کوئی وجود نہیں ہے اور اسی تشکل کی بحالی کے لئے ہمارا رسالہ الدعوۃ حکومت سے مطالبہ کرتا رہا ہے تاکہ اخوان رہنما اور کارکن فوراً معاشرے میں پھیلیں اور اسلام کا پیغام عام کریں اور مسلمانوں کے دلوں میں دین کی بنیادیں مضبوط کریں اور اگر موجودہ خلا کو پر نہ کیا گیا تو فساد کبیر پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔

لیکن موضوع کے اعتبار سے اس وقت اخوان مصر میں اچھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی عظمت و کردار اور ثابت قدمی نوجوان نسل پر اثر انداز ہو رہی ہے اسلامی ذہن و فکر رکھنے والے نوجوانوں نے تعلیمی اداروں کے اندر کام کا ایک اور راستہ نکال لیا ہے "الجماعۃ الاسلامیہ" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی عین شمس یونیورسٹی، اسیوط یونیورسٹی اور اسکندریہ یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیوں میں مخلصانہ کام کررہے ہیں اور اخوان لٹریچر اور پاکستان کے عظیم اسلامی مفکر ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور دیگر اسلامی رہنماؤں کی تالیفات ان کی ذہنی اور فکری غذا ہیں ان حلقوں کی سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

دیہاتوں اور مضافاتی علاقوں میں اسلام کی تبلیغ اور تخریبی نظریات کی تردید کے لئے ان کے قافلے ازہری طلبہ کی قیادت میں دورے کررہے ہیں۔

لڑکیوں کے اندر بھی اسلامی تہذیب کو اپنانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اس وقت مصر میں سب سے زیادہ اسلامی آواز کو بلند کرنے والے نئی نسل کے لوگ ہیں۔

اسلامی بیداری کی لہر

(س) آجکل مصر میں اسلامی لہر آئی ہوئی ہے مدرسوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کا نام لیا جا رہا ہے۔ مگر طریق عمل میں کچھ غلطیاں بھی ہیں آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

(ج) مصر ہو یا دنیا کی کوئی سرزمین اس وقت لہر کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسلامی سیلاب جس کو ہم لہر سے تعبیر کرتے ہیں ضرور کامیاب ہوگا اس لئے کہ اس کی بنیاد تقویٰ اور اخلاص پر رکھی گئی ہے اور اس سیلاب کا راستہ روکنا آسان کام نہیں ہے جہاں تک غلطی ہونے کا سوال ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں صاف طور پر مذکور ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور اس سے غلطی ہونا ایک فطری امر ہے اور اس طرح خطا کاروں میں وہ لوگ بہت اچھے ہیں جو اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اللہ سے استغفار کرتے ہیں۔

اخوان کا دیگر اسلامی جماعتوں سے تعلق

جناب مرشد عام عمر تلمسانی سے یہ سوال پوچھا گیا کہ:

س: اخوان المسلمون مصر میں ایک بڑی اسلامی جماعت ہے تو اخوان کا دیگر اسلامی جماعتوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

ج: اخوان جماعتوں اور تنظیموں کے حریف نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ ساری تنظیمیں اسلام ہی کی نصرت و حمایت میں مصروف ہیں اگرچہ ان کی سرگرمیوں کے دائرہ عمل مختلف ہیں اور ہر جماعت کا یہ بنیادی حق ہے کہ اسلام کی ترقی کے لئے اسلامی جذبے کو بیدار کرنے کے لئے اپنے اپنے دائرے کے تحت کام کرے البتہ مصر کی ساری جماعتوں کے سربراہان مختلف اوقات میں آپس میں ملتے رہتے ہیں اور ایکدوسرے کے خیالات سے متعارف ہوتے رہتے ہیں اور اخوان کے ساری جماعتوں کے ساتھ تعلقات ہیں۔

س: اخوان المسلمون اور مصر کی مختلف جماعتوں میں کیا فرق ہے جبکہ ان کا موقف ایک ہی ہے۔

ج: ہر جماعت اور ہر حزب کا اپنا دستور اور منشور ہوتا ہے اور اسی دستور کے مطابق اس کے ممبران منتخب کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اخوان کا اپنا دستور اور منشور ہے۔ اور وہ ہے کتاب اللہ اور سنت رسول سے ماخوذ شدہ نظام اور اس نظام میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں اگرچہ حالات اور افراد تبدیل ہو جائیں لیکن اخوان کا موقف تبدیل نہیں ہو سکتا لیکن دیگر پارٹیوں کا مقصد عظیم صرف حکومت تک پہونچنا ہوتا ہے ان کی وفاداریاں کبھی دوسری پارٹی کے ساتھ بھی وابستہ ہو جاتی ہیں اور یہ بات اخوان میں نہیں بھی ان کا مقصد حکومت حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ حکومت کو قرآن و سنت کی روشنی میں چلانا چاہتے ہیں اور اگر اس مقصد کو کوئی اور پارٹی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس میں اخوان کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور دیگر پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہمارے لئے اس لئے مشکل ہے کہ یہ پارٹیاں انتخابات کے وقت مختلف اندازہ وعدے اور حربے استعمال کر کے عوام سے ووٹ مانگتی ہیں اور تعلیم اسلام کے سب دیانت یعنی صدق وامانت اور حسن اخلاق کو بالکل ہی بالائے طاق رکھ دیتی ہیں اور ان میں تفرقہ بازی اور گروہ بندی ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ ان پارٹیوں کے سربراہان صوبائی تعصب یا کسی مخصوص نعرہ کے تحت میدان سیاست میں آگئے ہیں اور ان کا کام محدود ہو جاتا ہے انہی وجوہات سے اخوان المسلمون کا ان کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہے اس لئے کہ اخوان کا یہ مقصد نہیں ہے۔

س: کہا جاتا ہے کہ مصر جیسے اسلامی ملک میں جماعت اسلامی نام کی اسلامی جماعت ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ جو شخص اس جماعت میں شامل نہیں ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔

ج: اسلام ایک عالمی دین ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے لیکن مذہب اسلام کو مزید ترقی دینے کے لئے مختلف طریق کار ہیں اور ہر جماعت کا حق ہے کہ اسلام کو ترقی دینے کے لئے اسلامی جذبہ کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے طور پر کام کرے اس وجہ سے اخوان کو مصر میں ایک یا ایک سے زائد جماعت ہونے پر

کوئی اعتراض نہیں ہے اور یہ کہنا کہ جو اخوان المسلمون کا ممبر نہیں یا رکن نہیں وہ مسلمان نہیں ہے بالکل غلط ہے اخوان نے کبھی یہ نہیں کہا بلکہ اخوان کے یہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون شخص مذہب اسلام سے زیادہ لگاؤ اور محبت رکھتا ہے اور اس کا اسلام سے گہرا رشتہ قائم ہے۔ ہمارے یہاں سب زیادہ اہمیت یہ ہے کہ اخوان سارے جہان کے مسلمان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کی کتاب قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر یقین رکھیں اور اس کا دستور اپنائیں۔

اگر اخوان کا یہ مطالبہ پورا ہوجاتا ہے تو ہم سب مسلمان ہیں اور سب اخوان ہیں اور اس دعوت کو امام حسن البناء نے بلند کیا اور بنیادی طور پر مختلف آئین اور دستور کو ترتیب دیا اس میں یہ ہے کہ:

ہم کسی مسلمان کو اس وقت تک کافر نہیں کہتے جب تک کہ وہ اسلام کی بنیادی چیز جیسے کلمۂ طیبہ یا قرآن یا ملائکہ یا ضروریات دین سے منحرف نہیں ہو جاتا۔ ہم اس کو کافر نہیں کہتے۔

مختلف تفاسیر کے بارے میں

س: آج کل اسلام کے نام پر مختلف تفاسیر سامنے آرہی ہیں ان میں تفسیر علم القرآن الکریم، تفسیر علم النفس الاسلامی اور تفسیر یا ایجاد علم الاقتصاد الاسلامی۔ آپ ان تمام اصطلاحات کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

ج: ہم ان تمام تفسیرات کو غلط نہیں کہتے اس لئے کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے اور تمام ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام پر یقین رکھنے والے دنیا کے کسی بھی گوشہ میں وہ رہتے ہوں ان کو چاہئے کہ اسلامی کتب کو پڑھیں۔ اگر انہوں نے صحیح طریقے سے اسلام کا مطالعہ کیا تو بعید نہیں ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی روح کو حاصل کرلیں اور پھر ان کو کسی دوسری چیز کی حاجت نہ ہوگی۔

اخوان کا طریق کار

اخوان کے طریق کار پر گفتگو کرتے ہوئے جناب تلمسانی نے فرمایا کہ اخوان کا راستہ تربیت کا راستہ ہے یہ وہ راستہ ہے جس پر کوئی قدم بھی نہیں لگا سکتا اگر ہمیں اپنے اوپر ضبط ہو اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ راستے پر چلنا چاہیں تو کوئی طاقت ہمیں اس راستے پر چلنے سے روک نہیں سکتی اور اس کے نتائج ظاہر ہوکر رہیں گے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہر بچہ کا سربراہ اپنے کنبے کی تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کرے۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے اور اسلام کے معیار مطلوب کے مطابق ہم افراد تیار کرنے جائیں تو سوچئے کہ اقتدار کس کے قبضے میں ہوگا ان ہی تربیت یافتہ افراد میں سے علماء، جج، فوجی افسر، وزراء اور سربراہان مملکت مقرر ہوں گے اور ان شاء اللہ وہ انقلاب آکر رہے گا جس کے لئے ہم کام کر رہے ہیں۔

مسئلہ فلسطین

مسئلہ فلسطین کے بارے میں جناب مرشد عام نے فرمایا اس سلسلے میں ہماری رائے بالکل واضح اور صاف ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فلسطین اسلام کی سرزمین ہے اور ہمارے اوپر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم اسے اور دوسرے مسلمان علاقوں کو غیروں کے قبضے سے نکالیں۔ ہم اس سرزمین پر یہودیوں کو شہریوں کی حیثیت سے تمام شہری حقوق کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہیں لیکن مسلمانوں کے کسی بھی علاقے پر ان کی حکومت کا حق ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جناب تلمسانی نے اس سلسلے میں مزید فرمایا کہ اسرائیلیوں سے اپنے مکمل حقوق حاصل کرنے کا راستہ بڑا طویل اور پر صعوبت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم عوام میں اور خاص طور پر نوجوانوں میں گہرا اور پختہ ایمان اور یقین پیدا کریں انہیں مناسب ذہنی اور روحانی غذا مہیا کریں ان کی نگہداشت کریں اور علم نافع اور اعلیٰ نمونے اور صحیح تربیت کے ذریعے سے انہیں نشوونما دیں۔

جناب تلمسانی نے آخر میں متنبہ کیا کہ مسلمان اپنی موجودہ کمزوری اور دشمن کی مادی قوت کو دیکھ کر مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ ہمارے دشمن تو چاہتے ہی ہیں کہ ہمارے اندر وہ یاس و قنوطیت پیدا ہوکے ہمیں بے دست و پا کردیں ہم ان شاء اللہ مشکلات پر غالب آئیں گے۔ یقین مانئے کہ منزل انہی کو ملتی ہے جو صبر کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن رہتے ہیں۔ !!!

مولانا عنایت اللہ سبحانی
(ابن سعود یونیورسٹی (ریاض))

مولانا کی قرآن فہمی اور تحریک سے وابستگی

ع
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مولانا امین احسن اصلاحی کو قرآن سے جتنا شغف تھا، اس شوق جتنا وسیع تھا اور مینائے طلب جتنی گہری تھی، اسی کے بقدر مبداء فیاض نے انہیں علم قرآن کے لعل و گہر سے مالا مال فرمایا تھا۔ مولانا واقعتاً ایک متبحر عالم قرآن اور ترجمان القرآن امام فراہی کے سچے جانشین تھے۔ قرآن پاک کے سلسلے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بڑی گہری تھی۔ وہ قرآن پاک کے رموز و اسالیب پر بہت زیادہ عبور رکھتے۔ وہ الفاظ کے مزاج شناس اور کلام کے ادا شناس تھے۔ آیات کے ترجمے بہت زیادہ اور اولیٰ انداز سے کرتے۔ مختلف ترجمے سامنے رکھتے اور بتاتے کہ اس میں یہ پہلو دب گیا ہے۔ اس ترجمے میں یہ بات رہ گئی ہے۔ پھر فرماتے اگر یوں کیا جائے تو کیا حرج ہے؟ مثال کے طور پر سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ اس کا ترجمہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کرتے ہیں:

	حیران درمیان کفر و ایمان
شاہ ولی اللہ دہلوی	متردد اند درمیان آں و آں
شاہ رفیع الدین صاحبؒ	ڈگدگے ہیں بیچ درمیان اس کے
شاہ عبدالقادر صاحبؒ	ادھر میں لٹکتے دونوں کے بیچ
مولانا تھانویؒ	معلق ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان

علامہ زمخشریؒ کی مشہور تفسیر "الکشاف" اور قرطبی کی تفسیر، احکام القرآن اور دیگر متداول کتب تفاسیر میں بھی اسی طرح کا مفہوم ملتا ہے۔ درس کے دوران جب یہ آیت آئی تو مولانا نے یہ سارے ترجمے دکھائے۔ پھر بتایا یہ ترجمے مفہوم کی پوری ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ مُذَبْذَبِیْنَ مشتق ہے ذبذبہ سے جس کے معنی ہیں خوب تیز دوڑنا اور مسلسل دوڑنا۔ اس میں تیزی اور تسلسل دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

خیال لام السلسبیل ودونها ۔ مسیرة شهر للبرید المذبذب

(ام السلسبیل کی خیال (تصور) مجھ تک آپہونچی حالانکہ وہ تیز اور مسلسل دوڑنے والے گھوڑے کی رفتار سے ایک ماہ کی مسافت پر رہتی ہے۔)

اس طرح آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ منافقین بد حواسی کے ساتھ فوج ایمان اور فوج کفر کے کیمپ میں آتے ہیں۔ ابھی وہ یہاں پہونچے بھی نہیں ہوتے ہیں جب تک انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اہل ایمان کا پلہ بھاری ہے وہ وہیں سے لوٹ پڑتے ہیں اور بے تحاشا اہل ایمان کے کیمپ کی طرف دوڑتے ہیں۔ ابھی وہ راستے ہی میں ہوتے ہیں جب تک ان کے کانوں میں آواز آتی ہے کہ ہوا کا رخ بدل گیا پھر وہ وہیں سے پلٹ پڑتے ہیں، اور دوڑ کر کفر کے کیمپ میں شامل ہو جانا چاہتے ہیں ان کی مستقل یہی کیفیت رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء۔

پھر یہاں مجہول کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسلسل دوڑتے ہیں نہ صرف یہ کہ وہ دوڑ رہے ہیں بلکہ

وقت پر مجبور تھے اگر وہ دوڑنے پر مجبور نہ ہوتے تو کہیں تھک کر بیٹھ جاتے تھے پھر ہر لمحے ٹھہر کر دم بھی لے سکتے تھے مگر جان کی تکمیل دوسرے کے ہاتھ میں ہے تو پھر دم لینے یا بیٹھنے کا کیا سوال؟ اب تو انہیں دوڑتے ہی رہنا پڑتا ہے کتنا ہی تھک کر چور ہو جائیں۔ ارباب ذوق بآسانی محسوس کر سکتے ہیں کہ "نفد بین" کی اس تشریح نے معنی کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اور منافقین کی سراسیمگی و حیرانگی کا نقشہ کس طرح نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ مولانا ترجمے میں محض الفاظ کی روح کھینچ کر رکھ دیتے۔ تفاسیر کے سلسلے میں بھی مولانا کی رائے بڑی جچی تلی ہوتی۔ روایات کی تاویل کے سلسلے میں مختلف نقطوں کو سامنے رکھتے اور مختلف مفسرین کی راؤں پر گفتگو کرتے ہوئے جس کی رائے زیادہ قوی اور نظم کلام سے ہم آہنگ ہوتی اس کو ترجیح دیتے بسا اوقات مضبوط دلائل کی روشنی میں تمام مفسرین سے اختلاف کرتے ہوئے نئی تاویل بتاتے مگر اس میں بھی انداز بہت ہی عاجزانہ اور منکسرانہ ہوتا۔ ذرا بھی ترفع اور تعلی کا شائبہ نہ ہوتا۔ نہ یہ گمان ہوتا کہ مولانا خود کو نمایاں کرنا اور ذہنی قابلیت کا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ ٹھوس اور علمی انداز سے مختلف تفاسیر اور تاویلات پر نقد فرماتے ہوئے آخر میں اس انداز سے فرماتے "اور سوچنے کا ایک رخ یہ بھی ہو سکتا ہے" اور "یا اس انداز سے بھی تاویل کی جا سکتی ہے" یا "آیت کا اگر یہ مفہوم لیا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہو"

وہ قرآن پاک کے صحیح معنوں میں رمز آشنا تھے۔ ان کا ذہن و دماغ قرآن پاک کے سانچے میں ڈھل کر رہ گیا تھا۔ ان کی نظروں میں اسی کا جلوہ سمایا رہتا۔ وہ جو کچھ دیکھتے اس کے آئینے میں دیکھتے اور جو کچھ پڑھتے اس کے آئینے میں پڑھتے۔ وہ سبع معلقات یا دوسرے عربی قصائد پڑھاتے تو یہ محسوس ہوتا کہ حسن و عشق یا بہر و شکار یا حرب و ضرب کی کوئی داستان پڑھی جا رہی ہے جیسا کہ عام طور سے ان کتابوں کو پڑھاتے وقت محسوس ہوتا ہے۔ مولانا کے ہاں ایسا محسوس ہوتا گویا قرآن پاک کے اسالیب پڑھے جا رہے ہیں لغۃ القرآن کو سمجھنے سمجھانے کی کوششیں ہو رہی ہیں وہ اشعار پڑھاتے وقت قرآنی نظائر کی طرف توجہ دلاتے جاتے۔ وہ قرآن پاک کے درس میں الفاظ کے سرسری معانی بتا کر نہ گزر جاتے بلکہ ان کا ماخذ اور اس کی اصل بتاتے۔ ان کی پوری لغوی تحقیق کرتے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں تھوڑی طلبہ کے اندر بھی مطالعہ کا ذوق پیدا کر دیا۔ ان کے ہاں لسان العرب اتنی کثرت سے دیکھی جاتی کہ وہ کچھ ہی عرصے میں بوسیدہ ہو کر رہ گئی حالانکہ وہ بہت ہی نفیس کاغذ پر چھپی ہوئی تھی۔

امام فراہی کی بہت سی کتابیں نامکمل رہ گئیں جب وہ آخری مرتبہ بیمار پڑے اور یہ احساس ہوا کہ پیمانۂ اجل لبریز ہو چکا ہے زندگی کا چراغ اب جلد ہی گل ہو جانے والا ہے تو انہوں نے اپنے تمام مسودات مولانا کے حوالے کر دیئے جو سر تا سر قرآنی علوم سے متعلق تھے اور فرمایا:

"یہ تمام نامکمل مباحث مکمل کر دینا"

یہ گویا مولانا پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار تھا۔ اس احساس کا اظہار تھا کہ ان مباحث یا مسودات کی تکمیل تمہارے ہی ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ مولانا پر امام فراہی کا یہ اعتماد مولانا کے تدبر قرآن کی ایسی روشن دلیل ہے کہ پھر کسی اور دلیل کی احتیاج نہیں رہ جاتی۔

امام فراہی نے اپنے نامکمل مسودات مولانا کے حوالے کر دیئے بڑی افسوس مولانا اپنے محسن و مربی استاد کے ادب و احترام میں ان کے مسودات پر قلم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جس کی وجہ سے قرآنی علوم و معارف کے بہت

درمیان تیزی سے دوڑ رہے ہیں جیسے کسی نے ان کی تکمیل پکڑ لی ہے اور وہ سب تاثرات انہیں یاد آ رہی ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے کھو گئے ہیں

سے اہم گوشے ہمارے سامنے نہ آسکے۔ کاش مولانا ان تمام مباحث کو مکمل کر ڈالتے کہ اس سے اس راہ کی بہت سی مشکلات آسان ہو جاتیں اور فہم قرآن کے سلسلے میں امام رازی کی گرانقدر تحقیقات سے ہم پوری طرح مستفید ہو سکتے۔

مولانا کے تلمیذ رشید مولانا بدر الدین اصلاحی نے ایک بار ان سے سوال بھی کیا کہ امام فراہی کی جب خواہش تھی تو آپ نے یہ کام کیوں نہ کر ڈالا؟ مولانا نے بڑی منکسر مزاجی کے ساتھ جواب دیا "ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگانے سے کیا فائدہ؟ امام فراہی کے مسودات کی تکمیل امام فراہی کا ہی قلم کر سکتا تھا۔"

ایک بار کا قصہ ہے جبکہ امام فراہیؒ ابھی حیات تھے انھوں نے مولانا اختر حسن صاحب اور ان کے جاں نثار ساتھی مولانا امین احسن صاحب کو قرآن پاک سے متعلق ایک موضوع دیا کہ اس پر وہ مقالے لکھ کر پیش کریں۔ دونوں شاگردوں نے اپنا اپنا مقالہ پیش کیا۔ امام فراہیؒ نے دونوں مقالے پسند فرمائے البتہ مولانا اختر احسن کا مقالہ دیکھ کر زیادہ خوش ہوئے اور فرمایا:

"جو لوگ خاموش رہتے ہیں سوچتے زیادہ ہیں"

خود مولانا امین احسن صاحب جو وقت کے ایک عظیم مفسر قرآن تھے اور جنھوں نے "تدبر قرآن" جیسی گراں قدر تفسیر لکھ کر ہمارے دینی و تحقیقی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے وہ اگرچہ مولانا کے بے تکلف دوست اور درجے کے ساتھی تھے مگر ہمیشہ قرآن فہمی میں مولانا کو اپنے سے بلند تر ہی سمجھتے رہے۔ وہ جب تک مدرسۃ الاصلاح پر رہے قرآن پاک سے متعلق کوئی بھی مقالہ یا رسالہ لکھتے تو اس کا مسودہ مولانا کو ضرور دکھا لیتے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح کے زمانہ قیام میں مدتوں "الاصلاح" نکالتے رہے جو مختلف پہلوؤں سے اردو رسالوں میں وقت کا سب سے زیادہ معیاری رسالہ تھا۔ اور زیادہ تر قرآنی علوم پر مشتمل ہوتا تھا۔ مولانا اس کی مرتبیت میں پورے طور سے شریک رہتے۔

مولانا کی وفات پر مولانا امین احسن صاحب کا بھی ایک پُر درد تعزیتی خط مدرسے پر آیا تھا افسوس ہے کہ وہ خط محفوظ نہ رہ سکا کہیں ضائع ہو گیا۔ اس میں مولانا نے پوری فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا تھا کہ مولانا اختر احسن صاحب تھے تو میرے دوست اور ساتھی لیکن میں انھیں استاذ اور مربی سے کم نہ سمجھتا تھا۔ وہ بلاشبہ فہم قرآن میں مجھ سے بہت آگے تھے۔ اس وقت تنہا وہی ایک شخص تھے جن کے "ہاں" اور "نہیں" پر مجھے پورا اعتماد ہوتا۔ وہ جس بات پر ہاں کہہ دیتے مجھے اطمینان ہو جاتا کہ وہ بات صحیح ہے اور جس بات پر "نہیں" کہہ دیتے اس کے سلسلے میں میں تردد میں پڑ جاتا۔

مولانا قرآن پاک کے کیسے رمز شناس تھے اور اس کے اسالیب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی اس کا اندازہ کرنے کیلئے ہم یہاں صرف ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس زمانہ میں مولانا امین احسن صاحب مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ تھے اس زمانے کا واقعہ ہے۔ ایک روز مولانا امین احسن صاحب مدرسۃ الاصلاح کے عربی کتب خانے میں داخل ہوئے اور گھنٹوں مختلف تفاسیر کی ورق گردانی کرتے رہے۔ وہ باری باری مختلف تفاسیر ہاتھ میں لیتے کچھ دیر دیکھتے پھر مایوس ہو کر رکھ دیتے۔ وہ دیر تک یوں ہی پریشان رہے۔ مولانا کچھ فاصلے پر بیٹھے یہ منظر دیکھتے رہے۔ جب مولانا امین احسن صاحب کو کسی تفسیر سے تشفی نہ ہوئی تو وہ مولانا کے قریب آکر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے۔

ہمارے مفسرین نے تفسیریں لکھیں مگر زیادہ تر غیر متعلق بحثوں میں الجھ گئے جو اصل گرہیں کھولنے کی تھیں وہ نہیں کھولیں۔

مولانا: آپ کو اشکال کیا ہے؟ کون سی گرہ ہے جو نہیں کھل رہی ہے۔

مولانا امین احسن: صافات میں آیا ہے "انکم کنتم تأتوننا عن الیمین، قالوا بل لم تکونوا مومنین۔"
یہاں "عن الیمین" کا کیا مطلب ہے؟
مولانا مفسرین اس کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں؟

مولانا امین احسن: کچھ لوگ کہتے ہیں "یمین" یہاں قوت و طاقت کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے اس لئے تم اپنے زور سے ہمیں گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ خیر و بھلائی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکہ دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے تھے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو وہ حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لئے ہم تمہارے فریب میں آگئے۔

اور کچھ لوگ کہتے ہیں یہاں 'یمین' قسم کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

مفسرین عموماً ان ہی تینوں مفہومات میں سے کوئی مفہوم یا انہیں سے ملتا جلتا کوئی مفہوم لیتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان تینوں مفہومات کو کلام کا تیور قبول نہیں کرتا۔ اسلوب کلام ان تینوں میں سے کسی ایک کی بھی گنجائش نہیں رکھتا۔ جو لوگ عربی ادب کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ بخوبی اس بات کو محسوس کریں گے پھر مولانا امین احسن صاحب جو امام فراہی کے تلمیذ رشید تھے اور عربی ادب کا بہت زیادہ ذوق رکھتے تھے، انہیں ان تاویلات سے کیونکر اطمینان ہوتا۔ بہرکیف انھوں نے مولانا کے سامنے یہ اشکال رکھا۔ تو مولانا نے چٹکی بجاتے اس کو حل کر دیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا:

اصل میں یہاں پر جہنمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں جھگڑے میں ہوتا یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کی بات کاٹ دیتا ہے ایک نے ابھی آدھی بات ہی کہی ہوتی ہے کہ دوسرا بول پڑتا ہے یہاں بھی صورت حال یہی ہے، عوام اپنے لیڈروں اور نیتاؤں سے کہنا چاہتے تھے:

انکم کنتم تأتوننا عن الیمین و عن الشمال و من بین ایدینا و من خلفنا (بلاشبہ تم آتے تھے ہمارے دائیں سے بائیں سے ہمارے سامنے اور پیچھے سے) جیسا کہ ان لیڈروں اور نیتاؤں کے سردار ابلیس نے روز ازل اللہ تعالیٰ سے کہا تھا (لَآتِیَنَّهُمْ مِنْ بَیْنِ أَیْدِیهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِینَ) (میں حملہ آور ہوں گا ان پر ان کے سامنے سے، ان کے پیچھے سے ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اور ان کے بائیں سے اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا) لیکن ابھی پیروؤں نے آدھی ہی بات کہی (انکم کنتم تأتوننا عن الیمین) تب تک لیڈروں نے عجلت سے ان کی بات کاٹ دی (قَالُوا بَلْ لَمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِینَ) (انھوں نے کہا بلکہ تم تو ایمان لانے والے تھے ہی نہیں)

یہ اسلوب کلام عربی میں کیا ہر زبان میں بکثرت ملتا ہے۔ اہل ذوق بآسانی محسوس کر سکتے ہیں کہ آیت کا یہ مفہوم لینے میں کلام کی بلاغت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے اور اہل دوزخ کی بے بسی اور بے نتیجہ بحث بازیوں کا نقشہ کس طرح نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ بہرکیف مولانا امین احسن صاحب نے آیت کی یہ تاویل سنی تو فرط مسرت سے جھومنے لگے اور فرمایا:

حیرت ہے، یہ کس قدر فطری اور عام فہم انداز بیان ہے جو ہماری اور ہمارے اکابر مفسرین کی گرفت میں نہ آسکا۔"

اس طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جن سے مولانا کے غیر معمولی قرآن فہمی، دقیقہ رسی اور نکتہ آفرینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر طوالت کے اندیشے سے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔

تحریک اقامت دین سے وابستگی:- مولانا صحیح معنوں میں ایک عالم قرآن تھے

اقبال کے الفاظ میں وہ کوئی کتاب خواں نہیں بلکہ صاحبِ کتاب تھے انھوں نے قرآن پاک سے جس طرح علمی و فکری رہنمائی حاصل کی تھی ان کے علوم و فکر کا سرچشمہ بھی وہی تھا اور کردار و عمل کا آئینہ بھی وہی تھا۔ وہ اس سمندر میں غواصی اسلئے نہیں کرتے تھے کہ اسکے آبدار موتیوں سے اپنی دوکان سجائیں اور لوگوں سے داد و تحسین حاصل کریں۔ ان کی تو بس یہ آرزو ہوتی کہ ان موتیوں کو اپنی قبائے زندگی میں ٹانک لیں اور رب کے پسندیدہ و مقرب بندے بن جائیں پھر چونکہ وہ ایک سچے عاشقِ قرآن تھے اسلئے جہاں ان کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ اس کتاب مقدس کا سچا نمونہ اور اس کی چلتی پھرتی تصویر بن جائیں وہیں فطری طور پر یہ تمنا بھی ہوتی کہ اس کتاب ہدایت کو زیادہ سے زیادہ عام کریں اور سارے آفاق میں اس کا ڈنکا بجا دیں۔ جس کتاب کی برکتوں سے وہ خود بہرہ مند ہوئے ہیں اس سے دوسروں کو محروم نہ رہنے دیں کہ ایک بندۂ مومن کے احساسات یہی ہوا کرتے ہیں۔ پھر جس کتاب سے انہیں عشق تھا خود اس کتاب کا بھی یہی مطالبہ تھا۔ وہ کتاب صرف نیک بننے اور نیکی کرنے کا ہی مطالبہ نہیں کرتی بلکہ نیکی کو عام کرنے اور دوسروں کو نیک بنانے کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ وہ ایمان اور عمل صالح کیساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی تقاضہ کرتی ہے وہ دین کو اپنانے اور دین کو غالب کرنے کی بھی ترغیب دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا کبھی گوشہ نشینی کی زندگی پر قناعت نہ کر سکے۔ وہ پورے جوش اور ولولے کے ساتھ تحریک اسلامی یا تحریک اقامت دین سے وابستہ ہوئے اور زندگی کی آخری سانس تک وابستہ رہے۔

تحریک سے جذباتی لگاؤ: مولانا نے چونکہ پورے خلوص و جوش اور حسن نیت کے ساتھ تحریک میں حصہ لیا تھا ایک ناگزیر دینی ضرورت اور قرآن و سنت کا اہم مطالبہ سمجھ کر اسے اپنایا تھا اسلئے انہیں اس سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اور یہ جذباتی لگاؤ آخر دم تک قائم رہا۔ وہ کبھی سرد مہری اور بے رخی کا شکار نہیں ہوئے وہ چونکہ تحریک کو ایک اہم دینی ضرورت سمجھتے تھے اس لئے اس سے علیحدہ یا بیزاری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور نہ دوسروں کے لئے اس پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا امین احسن صاحب تحریک سے علیحدہ ہوئے تو وہ کافی متاثر تھے قطع نظر اس سے کہ مولانا امین احسن صاحب کو امیر جماعت سے جو اختلاف تھا وہ ان کے نزدیک صحیح تھا یا غلط تھا وہ اس کے حق میں بھی نہ تھے کہ مولانا تحریک سے الگ ہو جائیں۔ اجتماعی امور اور اجتماعی مصالح میں باہم اختلاف رائے ہونا ایک فطری بات ہے لہٰذا اس اختلاف کو اتنی اہمیت دینا کہ اس کی وجہ سے تحریک سے علیحدگی کی نوبت آجائے یہ مولانا کے نزدیک صحیح نہیں تھا۔ پھر علیحدگی کے بعد مولانا امین احسن صاحب نے تحریک کے خلاف جب تنقیدی کلام لکھنے شروع کئے تو اس سے مولانا کو اور تکلیف ہوئی چنانچہ مولانا نے مولوی ممتاز صاحب اصلاحی کے ذریعہ مولانا امین احسن کو نہایت دل سوزی کے ساتھ پیغام بھیجا کہ اگر آپ نے خوب سوچ سمجھ کر تحریک سے علیحدگی کا ہی فیصلہ کر لیا ہے تو اپنے طور پر کوئی اور تعمیری کام کیجئے خواہ مخواہ تحریک کے تعاقب میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کیجئے۔

مولانا تحریک اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ کے ایک اہم رکن تھے اور اس حیثیت سے وہ تحریک کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتے اور اس کے فروغ و استحکام کے لئے برابر فکرمند رہتے وہ ان چیدہ شخصیات میں سے تھے جو تحریک کا ذہن و دماغ سمجھی جاتی ہیں۔ وہ تحریک کے ہر مسئلے پر سنجیدگی سے غور فرماتے اور ہر معاملے میں بڑی جچی تلی رائے رکھتے

اقامت دین کی اصطلاح: تحریک کے دستور میں پہلے تحریک اسلامی کا نصب العین "حکومت الٰہیہ" کے قیام کے لئے جدوجہد بتایا گیا تھا جس پر کوتاہ نظر دوستوں نے شبہات دیے

چائی اور تحریک کو اوچھے اور بے ہنگم اعتراضات کا نشانہ بنایا۔ مولانا نے اس معاملہ پر بڑی سنجیدگی سے غور فرمایا پھر دستور کی عبارت بدل دی۔ یعنی حکومت الٰہیہ کے قیام کے بجائے اقامت دین کر دیا گیا۔ مولانا نے فرمایا یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے۔ اس لئے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اپنے نصب العین کی تعبیر و توضیح کے لئے یہی اصطلاح استعمال کرنی چاہئے کہ اس سے کج بحث معترضین کیلئے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔ دوسرے جو بات ہم کہنی چاہتے ہیں وہی بات اور زیادہ جامعیت کے ساتھ اس لفظ سے ادا ہوگی۔ دوسرے جماعت یہ نہایت مناسب اور برمحل اصطلاح تھی جس کا تحریک اسلامی کے تمام ہی ذمہ داریوں نے خیر مقدم کیا اور خوشی خوشی اسے قبول کر لیا۔ پھر بانئ تحریک کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور اس ترمیم کو پسند فرمایا۔

جماعت ہی کا لٹریچر کیوں؟

اسی طرح ایک بار تحریک کے کچھ چوٹی کے ذمہ دار اکٹھا تھے ارکان ہی میں سے ایک صاحب نے سوال کیا لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم لوگ بہت متعصب ہیں صرف اپنا ہی لٹریچر دوسروں کو پڑھاتے ہیں اس کا کیا جواب ہوگا؟ لوگوں کو کیسے مطمئن کیا جائے؟ اس پر کسی ذمہ دار نے جواب دیا کہ لوگوں کا یہ اعتراض صحیح نہیں ہم اپنا لٹریچر بھی پڑھاتے ہیں اور دوسری اچھی دینی کتابیں بھی پڑھاتے ہیں ہم اس معاملہ میں ذرا بھی تعصب کو راہ نہیں دیتے اور نہ اسے پسند کرتے ہیں۔

مولانا اگرچہ بہت ہی کم سخن انسان تھے وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ تھے مگر جہاں موقع آجاتا وہاں بولنے سے چوکتے بھی نہ تھے۔ ان صاحب نے اپنی بات پوری کی تو مولانا نے فرمایا: غالباً ابھی بات واضح نہیں ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم اپنا ہی لٹریچر تقسیم کرتے اور اسی کو پڑھاتے ہیں مگر اس کا سبب تعصب نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک تحریک کے علمبردار ہیں ہماری ایک سوچی سمجھی فکر اور ایک متعین پروگرام ہے۔ اسی پروگرام کے تحت ہم اپنا ایک آرگن نکالتے اور ایسا لٹریچر تیار کرتے ہیں جو اس فکر کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ جب ہم ایک فکر کو لے کر چل رہے ہیں اور اسی کے لحاظ سے لٹریچر تیار کر رہے ہیں تو اپنا یہ لٹریچر پڑھوائیں گے یا ایسی کتابیں پڑھوائیں گے جو یا تو ہماری فکر سے ٹکراتی ہیں یا پورے طور سے اس سے میل نہیں کھاتیں؟

مولانا کا یہ جواب اس قدر واضح دو ٹوک اور حقیقت پسندانہ تھا کہ اس کو سب لوگوں نے پسند کیا ورنہ اس سے پہلے لوگوں کو اس سوال کا جواب دینے میں بڑی توجیہات کرنی پڑتی تھیں۔

مولانا پورے ذوق و شوق کے ساتھ تحریک کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ پوری سنجیدگی سے اس کے مسائل پر غور کرتے اجتماعات میں پابندی سے شرکت کرتے۔ ان کی تنخواہ بہت مختصر تھی مگر اپنی حیثیت کے مطابق وہ تحریک کی اعانت بھی کرتے وہ اگر کسی مجبوری کے تحت کسی اجتماع میں شریک نہ ہو پاتے تو یا تو دونوں طرف کا کرایہ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا دیتے یا کسی رفیق جماعت کے پاس اجتماع میں جانے کیلئے کرایہ نہ ہوتا تو اسے دونوں طرف کا کرایہ دے دیتے۔

حیدرآباد میں جماعت کا پہلا کل ہند اجتماع ہوا تو اس میں جنوبی ہند کے تمام ارکان اور شمالی ہند کے امراء مقامی کے لئے شرکت لازمی قرار دی گئی۔ مولانا بھی چونکہ مقامی امیر اور مجلس شوریٰ کے رکن تھے اس لئے ان کو بھی اس میں شرکت کرنی تھی۔ مگر کرایہ اچھا خاصا تھا اس لئے کم از کم ساٹھ ستر روپئے درکار تھے جو مولانا کی حیثیت سے بہت زیادہ تھے اس لئے مقامی جماعت نے بیت المال سے کرایہ دے کر مولانا کو اجتماع میں شرکت کے لئے روانہ کیا۔ بیت المال کے کرایہ سے مولانا جانے کو تو چلے گئے مگر واپس آتے ہی بیت المال کے انچارج سے فرمایا: کر لیجئے کہ وہ ستر روپئے میرے نام قرض

لکھ دیے جائیں۔ میں ہر ماہ ... روپے کے حساب سے قسط وار ادا کروں گا۔ شدہ شدہ یہ بات ناظم ضلع تک بھی پہنچی تو انھوں نے اسے قرض تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: آپ نے خود تو مانگا نہیں تھا وہ تو مقامی جماعت نے آپ کو بھیجا تھا۔ لہٰذا وہ قرض کب ہوا؟ مولانا نے یہ باتیں سنیں تو حسب عادت خاموش رہے۔ انھوں نے اس پر اصرار نہیں کیا۔ وہ کسی بات پر بلاوجہ اصرار کرنے کے عادی نہ تھے۔ البتہ انھوں نے وہی کام ایک خوبصورت انداز سے کر ڈالا۔ وہ اعانت جیب خاص سے ہر ماہ پانچ پانچ روپے کی رسید کٹواتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ پوری رقم ادا کر ڈالی۔ انھوں نے تحریک سے ایک پیسہ کا فائدہ اٹھانا بھی گوارہ نہ کیا۔ وہ ہمیشہ تحریک کو دیتے ہی رہے۔ کبھی اس سے کچھ لینے کے آرزومند نہ ہوئے۔ وہ تحریک کے بہت ہی مخلص اور بے لوث کارکن تھے۔ انھیں تحریک سے سچا قلبی لگاؤ تھا۔

سمع و طاعت اور احترام نظم:

جماعتی زندگی میں سب سے اہم چیز امیر کی اطاعت اور نظم جماعت کا احترام ہے۔ مولانا اس سلسلہ میں بھی ایک نمونے کے انسان تھے۔ وہ ہر نظم جماعت کی سختی سے پابندی کرتے اور امیر کے کسی حکم میں چون و چرا نہ کرتے۔ ... کے برعکس وہ ہر شخص امیر کا احترام کرتے کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی تو اسکو بھی گوارا کر جاتے۔ کئی سال کی بات ہے مولانا ... جماعت تھے اور ملک حبیب اللہ صاحب بستوی امیر حلقہ تھے۔ اتفاق سے ایک بار ایسا ہوا کہ وہ مدرسۃ الاصلاح [illegible]

ملاقات نہ ہو سکی پھر میں کیسے یقین کروں کہ آپ کو جماعت سے کوئی تعلق خاطر ہے؟" ملک صاحب نے کچھ اسی انداز کی تحریر مولانا کے نام لکھ دی تھی۔ دونوں کے رتبہ و مقام کے لحاظ سے تحریر بہت سخت تھی اس زبردست ادیب اور مفسر قرآن کے آگے ملک صاحب کی حیثیت ہی کیا تھی مگر مولانا کی علمی و اخلاقی عظمت وہاں بھی ان سے جدا نہ ہوئی۔ اس موقع پر بھی وہ بڑے ہی نظر آئے۔ انھیں ذرا بھی طیش نہ آیا۔ بڑی خاکساری کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز میں کچھ اس انداز کی تحریر ملک صاحب کو لکھ بھیجی: "یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ آپ مدرسہ پر تشریف لائے اور میں ملاقات نہ کر سکا۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ مجھے آپ کی آمد کی اطلاع نہ ہو سکی۔ آئندہ سے انشاء اللہ ایسی کوتاہی نہ ہوگی۔" خود مولانا حبیب اللہ صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے مولانا نے ملاقات کا اتنا اہتمام کیا کہ حیرت ہوتی تھی پہلے کسی اور کو اطلاع ہو یا نہ ہو ان کو اطلاع ہو جاتی تھی اور وہ دوسروں سے پہلے ملاقات کیلئے آ جایا کرتے تھے۔ سچ ہے بڑے لوگ ہر جگہ بڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی بڑائی کہیں ان سے جدا نہیں ہوتی۔ ملک صاحب بھی مولانا کی اس عجز و انکسار سے بے حد متاثر ہوئے۔ اب بھی وہ اس واقعہ کو یاد کر کے متاثر ہو جایا کرتے تھے۔

مولانا اختر احسن کی زندگی ہی میں مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت تھے۔ مولانا ابو اللیث صاحب مولانا اختر احسن صاحب کے عزیز شاگرد تھے لیکن مولانا کا اپنے شاگرد کے سلسلے میں جو طرز عمل ہوتا اس کے پیش نظر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ امیر جماعت مولانا مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مولانا ہمیشہ ان کے ساتھ محبت و احترام سے پیش آتے۔ ان کے بات ہوتے نظم کی پوری پوری پابندی کرتے۔ جماعت کے جو فیصلے ہوتے ان کی تعمیل میں ہمیشہ سب سے پیش پیش رہتے ایک امیر کے کسی امیر کے جو حقوق ہوتے ہیں مولانا وہ سارے حقوق اپنے شاگرد امیر کے لئے تسلیم کرتے۔ ان کی شخصیت بڑی ...

بقیہ صفحہ ۱۲

غزل

ہر بند نسل و رنگ سے آزاد ہم اٹھے
اپنے چمن میں صورتِ شمشاد ہم اٹھے

اپنوں کے جبر پہ جو ہوا تھا گمانِ غیر
آنکھوں میں لے کے تیورِ جلاد ہم اٹھے

معیار اپنی خاک کا گرنے نہیں دیا
پامال جب ہوئے تو بر باد ہم اٹھے

جب باغباں نے دام بچھائے چمن چمن
اپنی کمیں گاہ سے صیاد ہم اٹھے

کہسار چپ ہیں وادی و صحرا خموش ہیں
جیسے یہاں سے صورتِ فرہاد ہم اٹھے

افتاد دل پہ آج پڑی ہے کوئی شفق
یہ کیا کہ اپنی بزم سے ناشاد ہم اٹھے

شفق طاہری

غزل

وہ جن کو محبت کا قرینا نہیں آتا
جیتے تو ہیں لیکن انہیں جینا نہیں آتا

کیا ان سے بھلا ہوگا مداوائے غمِ غیر
خود اپنے گریباں جنہیں سینا نہیں آتا

وہ بحر کی امواج سے ٹکرائیں تو کیونکر
طوفاں میں کبھی جن کا سفینا نہیں آتا

خود اپنی ہی قوت پہ جیا کرتے ہیں ہم لوگ
غیروں کے سہارے ہمیں جینا نہیں آتا

سرکارِ دو عالم کی غلامی کوئی کم ہے
ہر شخص کے ہاتھوں یہ خزینا نہیں آتا

میں شاعرِ فطرت ہوں مجھے حضرتِ فائق
بس تذکرۂ ساغر و مینا نہیں آتا

ابرار احمد فائق

محمد طاہر ایم اے
(بہرائچ)

حلقۂ یاراں

اس شمارہ کے مضامین آپ کو کیسے لگے؟ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں اور حلقۂ یاراں میں شامل ہوں۔ عالم اسلام اور وطن عزیز میں ہونے والے واقعات پر مختصر تبصرہ بھی شامل اشاعت کیا جا سکتا ہے۔ ادارہ کا تمام خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں
(ادارہ)

ایک ہمدرد کا طویل مراسلہ :-

مکرم و محترم جناب مدیر مسئول حیات نو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں آپ کے ماہنامہ کا حلقۂ یاراں کے اجتماع کا نپور منعقدہ ۸۳ء میں خریدار بنا تھا۔ اس کے بعد ایک بار منی آرڈر سے زر تعاون بھیجا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے زر تعاون واجب الادا چل رہا تھا اور میں تساہلی کی وجہ سے اس کی ادائیگی نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر رسالہ بھی شاید ڈاک اور دفتر کی بدنظمی کی وجہ سے ناغہ ہو گیا تھا لیکن جب سے نیا انتظام ہوا ہے تب سے رسالہ پابندی سے آ رہا تھا اور رسالہ میں برابر اظہار خیال اور مشورے کی دعوت دی جا رہی اور طبیعت بہت چاہ رہی تھی کہ کچھ عرض کروں لیکن بعد مخاطبتی تساہل، علالت تفکرات نیز زر تعاون ادا نہ ہونے کی شرمندگی کی وجہ سے اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اب کل آپ کا رسالہ وی پی سے پہونچا اتفاق سے جیب میں پیسے موجود تھے فوراً ادا کر کے چھڑا لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک تاخیر شدہ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا۔ اب اس وقت موسم سرما کی تعطیل چل رہی ہے۔ معاشرہ اور امتحان سے بھی فرصت مل چکی ہے اس لئے اظہار خیال کیلئے وقت نکل آیا ہے اور گذشتہ تساہل کی تلافی کے لئے تو میں اظہار خیال کر رہا ہوں۔ کچھ باتیں معترضانہ ہونے کی پیشگی معافی چاہوں گا۔

آپ کا رسالہ ایک تحریک کا رسالہ ہے جس کے سرمایہ کے ایک ایک پیسہ کا صحیح مصرف ہونا چاہئے اس نقطۂ نظر سے پیش نظر رسالہ دسمبر ۸۳ء میں کچھ زیادہ اسراف پا رہا ہوں۔ رسالہ میں کاغذ کیجئے اس کو معمولی کر کے کافی بچت کی جا سکتی ہے اور لاگت کم ہو سکتی ہے اس کے علاوہ رسالہ کی کتابت میں بھی اسراف ہے فہرست مضامین اور دوسری تفاصیل سرورق پر ہی ہو سکتی تھیں جیسا کہ قدیم رسالہ "زمانہ" کا نمونہ میں دیکھنے میں آتا تھا اس طرح ایک صفحہ بچ جاتا۔ سرورق کے اندر کی طرف انجمن طلبۂ قدیم کے اغراض و مقاصد کو بہت زیادہ جلی حروف کر کے پورا ایک صفحہ استعمال کیا گیا ہے اس کو بھی نصف صفحہ میں لکھا جا سکتا ہے اس کے علاوہ عنوانات کے لئے پیشانی پر بہت زیادہ جگہ چھوڑی گئی ہے صفحہ ۳۲ و ۳۳ پر نظم و غزل کی کتابت پر بھی ضرورت سے زیادہ جگہ صرف کی گئی ہے پشت کے اندر کی طرف چھپا اشتہار بھی نصف صفحہ میں آ سکتا ہے اس طرح سب ملا کر غالباً ساڑھے تین صفحات کی بچت ہو جاتی ہے اور دو مزید مضامین چھپ سکتے تھے۔

۲- "دعوت فکر" کے عنوان سے اداریہ میں ملت، ملک اور عالم اسلام کے فوری اہمیت کے مسائل پر تبصرہ ہونا چاہئے تھا مثلاً میرٹھ، علی گڑھ، دیوبند، بڑودہ، بنگال[?]، کشمیر، افغانستان[?] وغیرہ لیکن اس شمارہ میں اخلاقی بگاڑ کے دیرینہ مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس میں بھی اخلاقی گراوٹ پر شکایت کی گئی ہے۔[1] جب کہ میں اس موقع پر غالب کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں ؎

نکالا چاہتا ہے کام تو طعنوں سے کیا غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۳- تعدد ازدواج کا مضمون محنت سے لکھا گیا ہے اور معلومات افزا ہے۔

۴- دین سے انحراف آج کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ایشیا اور لبنان کے مسلمانوں کی نسلوں کا امریکہ اور جنوبی امریکہ میں گم ہو جانا ہر مسلم کے لئے نہایت افسوسناک خبر ہے لیکن آج خود اپنے ملک میں بھی ہم اس خطرے سے دوچار ہیں اور اس کے سلسلہ میں ہمیں انتہائی سرگرم عمل ہونے کی شدید ضرورت ہے۔

۵- اسلام کی کامیابی کے تصور میں ایک سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ دنیا میں مومنین وصالحین اور دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کو عموماً شہادت حق کا فریضہ انجام دینے کے باوجود طرح طرح کی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے حالانکہ ان کی کامیابی کے لئے قرآنی بشارت موجود ہے اور اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے انبیاء سابقین کو اس سے طویل مدت میں بھی دنیاوی کامیابی نہیں ملی۔ لیکن مجھ کو اس جواب سے اختلاف ہے۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ اب تک نبی آخرالزماں کے طریقہ سے دعوت حق کا کام کیا ہی نہیں گیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور اپنی سنت کو دہراتا۔ میں اس سلسلہ میں آگے اپنے خیالات کی مزید وضاحت کرنا چاہوں گا۔

۶- "اخوان المسلمون۔ ایک جائزہ اور مطالعہ" میں جناب عبید اللہ فہد فلاحی نے اس تحریک کی دعوت اور اس کے کارناموں کا ایک مختصر لیکن جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ اس قسم کے مضامین زندگی نو میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل فکر میں اخوان کا کافی تعارف ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ ہم نے اس تحریک کے خدمت خلق کے پروگرام کو صرف ذکر کے طور پر اختیار کر رکھا ہے اور عملی طور پر ان کی تقلید کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اگر ہمارے جیسے جمہوری ملک میں پرامن ملک میں ان پروگراموں کو اختیار کر لیا جائے تو دعوت نہایت جلد کامیاب ہو سکتی ہے۔

۷- رسالہ کا حصہ نظم، ایک نظم، ایک غزل اور اقبال کے چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے جو تناسب میں کم ہے۔ نظم میں جناب شبنم سبحانی صاحب نے خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں ارمغان خلوص پیش کیا ہے جو اپنی روانی اور تازگی سے اقبال کی یاد تازہ کرتا ہے لیکن جناب شبنم سبحانی صاحب اس نظم میں اتنی ثقیل ردیف لے کر چلے ہیں جو نہایت سنگ پا ہے اور موصوف کے کمال فن کے باوجود دو اشعار میں بے معنی ہو کر رہ گئی ہے ؎

خرد کا پیچ و خم یہ جنوں کا تصرف بلند
تری نگاہ میں مثل سپند ہے اب تک

وہ ناخدا جو سفینہ ڈبو دے تھا ساحل پر
ترے حضور وہی ارجمند ہے اب تک

نہ رہ سکا [illegible] شبنم تیرے اس سوالی کو
یہ شہسوار ترا بے سمند ہے اب تک

یہ استقامت کا رخ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو شبنم سبحانی کا مدعا ہرگز نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس کے بعد والے شعر سے ظاہر ہے ؎

خدا کو ڈر ہے کہ پھر جست و خیز فرمائے
کہ یہ غزال ترا بے زقند ہے اب تک

اس لئے اگر پہلا والا شعر دوسرے شعر کے بعد آتا تو یہ احتمال جاتا رہتا۔ آخری شعر میں خرینہ تر کی ترکیب محل نظر ہے۔[2]

---

[1] نومبر کے شمارے میں میرٹھ کے فسادات پر اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر اداریہ لکھا گیا ہے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اداریہ میں ملک و ملت کے فوری مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔

[2] اصل لفظ ترا ہے جو کاتب صاحب کی کرم فرمائی سے خرینہ تر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خرینہ ترا مہر بند ہے اب تک۔

۸- جناب سید راشد علی جالندھری صاحب کی غزلیں، غزل کے جدید اور تیکھے انداز کی ایک کامیاب کوشش ہے لیکن آج ضرورت ہے کہ ہر احساس رکھنے والا شاعر "من دگرم تو واقف اسباب" کہہ کر باطل افکار اور طاقتوں کے مقابلہ میں شمشیر برہنہ بن کر آئے۔ ہمارے تحریکی شاعر حضرات واقعاتی نظمیں لکھیں، اپنی شاعری میں مسائل کو شدت سے ابھاریں اور ان کے حل پیش کریں۔

اب پھر اس بحث کی طرف واپس ہوتا ہوں جو اسلام میں کامیابی کا تصور کے ضمن میں ادھورا رہ گیا تھا۔ تحریک اسلامی کے تمام وابستگان، چاہے طلبہ ہوں یا اخبار و رسائل، انجمنیں ہوں یا افراد ہم سب کا مقصد وجود و حیات، نصر اللہ عزیز مرحوم کے الفاظ میں کہ

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

لیکن دین کی سرفرازی کے لئے ہمیں رہنمائی صرف نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے مل سکتی ہے۔ انبیائے سابقین علیہم السلام کے حالات سے ہمیں جذبہ تو مل سکتا ہے لیکن ان کا دور نہایت قدیم اور غیر ترقی یافتہ ہونے کی بنا پر ہم ان سے رہنمائی نہیں لے سکتے۔ اس لئے ہم کو حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط علیہم السلام کے طویل دور دعوت کے بجائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دور سے سبق لینا ہے۔ اس میں تیرہ سالہ دور دعوت ہے جس میں افراد تیار کئے گئے اس کے بعد ہجرت اور تنظیم ہے، اس کے بعد جہاد ہے۔ صلح حدیبیہ ہے فتح مکہ ہے۔ یہ اقامت دین، اظہار دین، اور اعلائے کلمۃ اللہ کا مکمل نصاب ہے۔ یہ صرف ایک نسل کی مدت کا کام ہے۔ اگر اس مدت میں یہ کام نہیں ہو جاتے تو ہم کو غور کرنا پڑے گا کہ ہمارے کام میں کہاں خامی ہے اور ظاہر ہے کہ تحریک اسلامی ۱۹۴۱ء میں شروع ہونے کے بعد ۱۹۸۳ء میں ۴۲ سال کی مدت گزر چکی ہے اور ہم اپنی منزل کے قریب بھی نہیں ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے کام ہی میں کچھ خامی ہے۔ وہ خامی کہاں ہے۔ میرے خیال میں وہ خامی دعوت کے بعد کی منزل یعنی تربیت، ہجرت و تنظیم کے مسئلہ کی کوتاہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہر اسلام لانے پر ہر شخص کو اپنے سابق مال، اثر و اقتدار، آرام و آسائش، اعزہ و اقربا اور احباب سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے جس کا نقطۂ عروج ہجرت تھا اس میں ہر شخص کی آزمائش اور تربیت ہو جاتی تھی۔ ہر فرد اپنے مقدور بھر قربانی دے کر اسلام میں شامل ہوتا تھا لیکن ہمارے دور میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی ہونے کی بنا پر تحریک کے کارکنوں کو ان قربانیوں کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکا اور کارکنان زیادہ تر غیر تربیت یافتہ رہے۔ ان کی تربیت کے لئے ضروری تھا کہ اختیاری مالی اور جسمانی قربانیوں کا طریقہ اختیار کیا گیا جس میں بہت سوں نے کوتاہی کی۔ ہمارے جیسے دستوری اور قانون کی حکومت والے ملک میں دعوت قبول کرنے والوں کی تنظیم کا کام فوراً شروع کر دیا جانا تھا۔ تحریک کے ساتھ آنے والوں کی مکمل تعلیمی اور معاشی رہنمائی ہونی چاہئے تھی جس سے ہر فرد اپنے معاش سے مطمئن ہو کر اپنے بعد آنے والے افراد کی دستگیری کے لئے تدریج کر دیتا۔ کارکنوں کے ساتھ ان کے وابستگان تک اس نظام کو پھیلانا چاہئے تھا تاکہ (increase and multiply) کے اصول کی بنیاد پر ایک معاشرہ وجود میں آتا جو اپنی قربانیوں اور وسیع وسائل کی وجہ سے پورے مسلم معاشرے کو اپنے اندر سمیٹ لیتا اور پھر اس کے اثرات غیر مسلمین پر بھی پڑتے ان کی اکثریت یا تو اسلام قبول کر لیتی یا اپنی ملکی معاملات کو تحریک کے افراد کے تحت کرنے پر راضی ہو جاتی اس طرح دینی نظام قائم ہو جاتا۔

غیر جمہوری اور شخصی حکومتوں کے نظام میں بھی مسلم افراد کے درمیان حسن سلوک اور امداد باہمی کے نظام کو نہیں روکا جا سکتا اور وہاں بھی مثالی مسلم معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جو آہستہ آہستہ غیر مسلموں کو بھی غیر محسوس طور پر متاثر کر سکتا ہے۔ اس طرح اسلامی نظام کے لئے کام کرنے والوں کے لئے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

کہ ناچیز خادم کو اور آپ کے حقیر اساتذہ کو بھی دینی آب و تاب اور آپ کی محکم رہنمائی کا موقع اور توفیق عطا فرماتے۔ اب میں پھر ایک بار اس کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں اور آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کا مزید اس بات پر ممنون ہوں کہ آپ نے اس کنونشن کے انعقاد کے لئے اس ناچیز کا انتخاب کیا۔ اس سے میں کیا کہوں۔ بہرحال آپ کا احسان ہے جس پر میں آپ کا مزید ممنون ہوں۔ !!!

محمد منیع اختر

جامعہ کے گل و بہار

مولانا وحیدالدین خانصاحب کی تقریر

۲۰ جنوری کی بروز جمعہ مولانا وحیدالدین خانصاحب جامعہ تشریف لائے اور طلبہ کی خواہش پر خطاب بھی کیا۔ مولانا اقبال احمد صاحب نے رسمی طور پر آپ کا تعارف کرایا۔ رسمی اس لئے کہ طلبہ موصوف کو بخوبی جانتے ہیں مولانا نے تعارف کے دوران یہ جملہ کہا کہ موصوف کا ایک زمانے میں تحریک اسلامی کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر موصوف اس کارواں سے الگ ہو گئے۔ مولانا موصوف کو شاید یہ بات شاید گراں گزری چنانچہ جانے کے دوران آپ نے فرمایا کہ میں ۹۵ فیصد جماعت کا آدمی ہوں۔ میرا جماعت سے اختلاف ایک خاص قسم کا اختلاف ہے جب میں جماعت سے علیحدہ ہوا تو فکری لحاظ سے بہت سے لوگ میرے ہم خیال تھے لیکن میں نے کسی سے یہ نہیں کہا کہ تم جماعت سے الگ ہو جاؤ آج بھی بہت سے لوگ میری اس بات کی گواہی دیں گے یہاں تک کہ میری اہلیہ نے جماعت سے اپنے تعلق کی بنا پر مجھ سے استفسار کیا تو میں آبدیدہ ہو گیا اور میں نے ایسا کرنے سے روک دیا اس بات کا تذکرہ میں نے جملہ معترضہ کے طور پر کر دیا۔ تعارف کے بعد مولانا نے اپنی باتیں طلباء کے سامنے رکھیں۔ آپ نے فرمایا:

شہنشاہ اورنگ زیب کا واقعہ ہے کہ ایک بار انہوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو انکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اس وقت ان کے وزیر سعد اللہ خاں ان کے ساتھ تھے۔ جب اورنگ زیب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا عالی جاہ آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لیکر راس کماری تک لہرا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی آپ کی کوئی تمنا ہے اورنگ زیب یہ سوال سنکر کچھ دیر خاموش رہے پھر فرمایا۔ سعد اللہ! مرے خواہم! میں ایک مرد جانباز کا طالب ہوں

آپ نے فرمایا، جس طرح اورنگ زیب کو اپنی سلطنت کی بقا و استحکام کیلئے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو مردان کار ہوں اسی طرح آج اسلام کو مردان کار کی ضرورت ہے جو اسلام کی صداقت و حقانیت کا پرچم پوری دنیا پر لہرا دیں

پھر آپ نے ایک دوسرا واقعہ بیان کیا کہ میں اجتماع میں شرکت کی غرض سے حیدرآباد جا رہا تھا میرے ساتھ صرف ایک بیگ تھا ایرپورٹ پر جب چیکنگ کا مرحلہ آیا تو میں نے آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کیا میرا بھی بیگ چیک کرو گے؟ تو اس نے بڑی ترش روئی سے جواب دیا "(why not) کیوں نہیں"

لیکن جب اس نے میرا بیگ چیک کیا تو اس میں قرآن مجید اور چند کاغذات کے سوا کچھ نہ نکلا تو اس کا رویہ ایکدم بدل گیا اور مجھ سے بہت عزت و تکریم سے پیش آیا اور ترجمہ قرآن مجید کی فرمائش بھی کی

اس واقعہ سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک میں حامل بیگ تھا تو اس کی نگاہوں میں مشکوک تھا اور جب میں حامل قرآن ثابت ہوا تو وہ اس طرح پیش آیا گویا برسوں کا شناسا ہو

آج ہمارے اندر سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ ہم مادہ پرست ہو کر رہ گئے ہیں دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور جو چیز اصل ہے اس سے ہماری توجہ بالکل ہٹ گئی ہے اگر ہم آج حامل قرآن ہو جائیں تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے اور اسلام خود بخود پھیل جائے گا۔

پھر آپ نے دور جدید میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ آج اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مواقع ہیں اور تاریخ کی روشنی میں اس بات کو ثابت کیا کہ کس طرح حالات آج اسلام کے موافق ہیں۔